رکھنی چاہیے کہ ہر چند یہ لوگ جادوگر تھے اور ان کے اندر اس پیشہ کی بعض خصوصیات بھی، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، پیدا ہو گئی تھیں تاہم حق پسندی کی کچھ رمق ان کے اندر موجود تھی۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقابلہ کے لیے وہ خوش دلی سے نہیں آئے تھے بلکہ مجبور کر کے لائے گئے تھے۔ خود ان کا قول نقل ہوا ہے کہ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۷۳۔ طٰہٰ (ہم اپنے رب پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطاؤں اور اس سحر کو معاف کرے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا) ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اندازہ رکھتے ہوں کہ حضرت موسیٰ کوئی ساحر نہیں ہیں اور نہ انھوں نے جو چیز پیش کی ہے وہ سحر ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کے مقابلہ سے گریز کرنا چاہتے رہے ہوں لیکن فرعون اور اس کے کارندوں کے ڈر سے انھیں مجبوراً یہ کام کرنا پڑا ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر حق پسندی کی ایک روشنی دبی دبائی موجود تھی جو حضرت موسیٰ کے اس معجزے کی جلالت سے بھڑک اٹھی۔ سعادت کا کوئی شمہ بھی انسان کے اندر موجود ہو تو بتوفیقِ الٰہی وہ اپنا اثر دکھا ہی جاتا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۲۳-۱۲۴)

فرعون ایک کائیاں سیاسی تھا

یہ بڑا ہی نازک موقع تھا۔ فرعون اور اس کے درباریوں بلکہ اس کی پوری قوم کی ہوا بالکل اکھڑ چکی تھی لیکن یہ فرعون بھی بڑا ہی کائیاں سیاسی تھا۔ اس نے بگڑتے ہوئے حالات سنبھالنے کے لیے فوراً یہ اشتلا چھوڑا کہ یہ ان ساحروں اور موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ یہ ساحر ہم کو یہاں سے بے دخل کرنے کی سازش میں موسیٰ کے ساتھ شریک ہیں۔ انھوں نے پہلے سے آپس میں یہ مشورت کر رکھی تھی کہ ہم عین موقع پر اپنی شکست مان کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیں گے جس سے موسیٰ کی دھاک سب پر بیٹھ جائے گی اور اس طرح ہم موجودہ برسرِ اقتدار گروہ کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نے ان پر سازش اور بغاوت کا الزام رکھ کر ان کے لیے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا جو ریاست کے باغیوں کے لیے ملک کے قانون میں موجود تھی۔ یعنی پہلے ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں پھر برسرِ عام سولی دی جائے۔

فرعون کے قول اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس کی حکومت میں مذہبی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور رہ بھی کیسے سکتی تھی جب کہ بادشاہ خود اپنے آپ کو لوگوں کا ربِ اعلیٰ بنائے بیٹھا تھا۔ اس صورت میں تو جو بھی اس کے سوا کسی اور کو رب مانتا وہ لازماً فرعون کا باغی قرار پاتا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (۱۲۵-۱۲۶)

ایمان باللہ کا کرشمہ

ایمان باللہ کا کرشمہ دیکھیے۔ یہ وہی جادوگر ہیں جن کی دنائت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور مسخروں کی طرح

اپنے فن کے مظاہرہ پر بھرپور انعام کی التجا پیش کرتے ہیں یا ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی ان کے باطن کا ہر گوشہ اس طرح جگمگا اٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تاریکی کی کوئی پرچھائیں ان کے دلوں پر کبھی پڑی ہی نہیں تھی۔ اور یہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ یہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ اور پاکیزگی و قدوسیت کے ملائک صفت پیکر ہیں۔ غور کیجیے، فرعون نے کتنی بڑی دھمکی ان کو دی! لیکن انھوں نے اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ کچھ غم نہیں، اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دے دی تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور جب تیرا سارا غضب ہمارے اوپر اس جرم میں ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر، جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے تو جو کچھ تو کر سکتا ہے وہ کر گزر، اگر اس جرم کی یہ سزا ہے تو ہم اس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ایمان باللہ کے نتیجہ میں انقلابِ حال

اس انقلابِ حال کے سبب پر غور کیجیے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ اگر انسان ایمان سے خالی ہے تو اس سے زیادہ حقیر کوئی شے نہیں اور اگر وہ ایمان سے بہرہ مند ہے تو اس سے زیادہ بلند کوئی شے نہیں۔ 'رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ' یہ آگے پیش آنے والے حالات میں صبر و استقامت کی توفیق بخشے جانے کی دعا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا ہے اور فرعون نے اپنی سزاؤں کا۔ اب ہمارا سارا بھروسا اے رب، تیرے اوپر ہے۔ تو ہمارے اوپر صبر کے دونگڑے برسا اور تمام آزمائشوں کے علی الرغم موت ایمان و اسلام پر عطا فرما۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَاۗءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (۱۲۷)

فرعون کے درباریوں کی بوکھلاہٹ

اس کھلے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابی نے فرعون اور اس کے درباریوں کو بالکل بوکھلا دیا۔ درباریوں نے فرعون سے باصرار یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب موسیٰؑ اور ان کی قوم کو مزید ڈھیل دینے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اگر ان کو مزید موقع دیا گیا تو یہ آپ کو اور آپ کے بتوں کو چھوڑ بیٹھیں گے اور ملک میں بغاوت کرا دیں گے۔ فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمارا اقتدار پوری طرح ان کے اوپر مستحکم ہے۔ ہم ان کے ذکور کو قتل کرتے رہیں گے، ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہمارے قابو میں ہیں اگر ہم ان کو زور پکڑنے دینا نہ چاہیں تو یہ کیا کر سکتے ہیں۔

لڑکوں کے قتل کی سکیم

اوپر لڑکوں کے قتل اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کی ظالمانہ اسکیم کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ اسکیم اسی لیے اختیار کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کی تعداد ملک میں اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ وہ ارسٹوکریسی کے لیے خطرہ بن جائیں۔ اول اول تو یہ اسکیم دائیوں کے عدم تعاون کی وجہ سے ناکام ہو گئی لیکن فرعون اس ناکامی سے مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے عام لوگوں کو یہ حکم دے دیا کہ وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو دریا میں پھینک دیا کریں۔ یہاں فرعون نے اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم بہرحال ان کو اپنے لیے خطرہ نہیں بننے دیں گے۔ اگر ضرورت

محسوس ہوئی تو ہم اسی اسکیم کو مزید قوت و شدت کے ساتھ چلائیں گے۔

دو طرفہ خطرہ

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ فرعونی اسرائیلیوں سے اس درجہ خائف تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے کہ وہ مصر سے یک قلم نکل جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی تمام رفاہیت و خوش حالی انہی غلاموں کی رہینِ احسان تھی۔ اوپلے تھاپنے، اینٹیں بنانے سے لے کر زراعت اور تعمیرات کے سارے کام انہی کی مشقت سے انجام پاتے تھے۔ فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کا کام صرف عیش کرنا اور ان اسرائیلیوں پر حکومت کرنا اور ان سے بیگار لینا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں نہ تو فرعونیوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اسرائیلیوں کو بڑھنے اور پنپنے کا موقع دیں، نہ یہ ممکن تھا کہ ان کو یک قلم مصر سے نکل جانے دیں۔ اس دو طرفہ خطرے سے بچنے کے لیے فرعون اور اس کے لال بجھکڑوں نے یہ پالیسی بنائی کہ ان کی نرینہ اولاد کو قتل کر کے ان کی تعداد کو قابو میں رکھا جائے۔ آدمی جب اپنے حدود سے تجاوز کر کے خدائی حدود میں مداخلت شروع کر دیتا ہے تو اس کی عقل اسی طرح ماری جاتی ہے۔

فرعون کے دعوائے الوہیت کی نوعیت

'وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ' کی تاویل میں ہمارے علما اور مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ 'اٰلِهَتَكَ' کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے دیوی دیوتا بھی مصر میں تھے جن کی پرستش خود فرعون بھی کرتا تھا۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے رب اعلیٰ ہونے کے دعوے کی توجیہ کیا ہو گی؟ جو خود رب اعلیٰ ہونے کا مدعی ہو وہ کسی دوسرے دیوی دیوتا کو ماننے والا یا ان کی پرستش کرنے والا کیسے ہو سکتا ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فرعون اپنے زعم کے مطابق اپنے آپ کو مصریوں کے سب سے بڑے دیوتا — سورج — کا اوتار سمجھتا تھا۔ اس طرح اس کی حیثیت اوتار بادشاہ (GOD KING) کی تھی۔ گویا وہ بیک وقت مصریوں کا بادشاہ بھی تھا اور ان کے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر اور اوتار ہونے کے سبب سے ان کا رب اعلیٰ بھی۔ اس نے اپنے بے شمار اسٹیچو اور بت بنوا کر اپنی مملکت میں جگہ جگہ نصب کرا دیے تھے اور اس کی رعایا ان کے درشن اور ان کے آگے ڈنڈوت کرتی تھی۔ اس طرح بادشاہ کو بیک وقت رعایا پر خدائی اور شاہی دونوں کے اختیارات حاصل تھے۔ یہاں 'اٰلِهَتَكَ' کے لفظ سے اس کے انہی اسٹیچوؤں اور بتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس کی ذات کی نمائندگی کرتے تھے۔ مصر کے قدیم مندروں کے جو آثار ملے ہیں ان سے بھی اسی بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۲۸-۱۲۹)

تفسیر سورہ بقرہ کی فصل ۳۲ میں ہم اقامتِ دین کی جدوجہد میں صبر اور نماز کی اہمیت پر بحث کر چکے ہیں۔ درحقیقت

اقامتِ دین کی جدوجہد میں وسیلۂ ظفر صبر اور نماز

اس جہاد میں یہی دو چیزیں وسیلۂ ظفر ہیں۔ قرآن میں مشکلات راہ کے مقابلہ کے لیے ہر جگہ انھی دو ہتھیاروں سے مدد حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں اگرچہ بظاہر لفظ اللہ وارد ہوا ہے لیکن اس سے مراد نماز ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ نماز ہی ہے۔ فرعون نے اس شکست سے گھبرا کر بنی اسرائیل کو دبانے اور ان کی نسل کو تباہ کرنے کا جو عزم ظاہر کیا اس سے قدرتی طور پر بنی اسرائیل کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ ان کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰؑ نے ان کو نماز اور صبر کی تلقین کی۔ فتنوں اور آزمائشوں میں استقامت بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ 'وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ' (اور تمھیں صبر نہیں حاصل ہو سکتا مگر اللہ ہی کی مدد سے) اللہ کی یہ مدد حاصل کرنے کا واسطہ نماز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس نماز سے مراد صرف عام نماز نہیں ہے بلکہ وہ خاص نماز بھی ہے جس کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مکی زندگی کے ابتدائی پُرمحن دور میں کی گئی تھی۔ اسی چیز کی تاکید حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی کی گئی۔ سورہ یونس کی آیت ۸۷ کے تحت انشاء اللہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

رسول کے لیے غلبہ لازمی ہے

'اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ الایہ' یہ فرعون کے اس غرور کی جو 'اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ' کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، تردید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ سے اپنے متعلق جو چاہے قاہر و مقتدر ہونے کا دعویٰ کرتا رہے لیکن زمین کا اصل مالک اللہ ہے، وہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور عاقبت کار کی کامیابی بہرحال خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ رسولوں سے متعلق اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو لازماً ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا فرماتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ غلبہ ان کی زندگی ہی میں حاصل ہو یا ان کی زندگی کے بعد ان کے پیروؤں کو حاصل ہو اور قطع نظر اس سے کہ وہ اسی سرزمین پر قابض ہوں جس میں انھوں نے اپنی دعوت بلند کی یا اللہ تعالیٰ ان کو اس علاقے سے ہجرت کا حکم دے اور ان کی برومندی کے لیے زمین کے کسی اور خطے کا انتخاب فرمائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دشمن پر غلبہ تو ان کی زندگی ہی میں بلکہ مذکورہ بالا واقعات کے پیش آنے کے بہت تھوڑے عرصے کے بعد ہی حاصل ہو گیا لیکن ان کی امت کو حکومت عطا ہوئی فلسطین کی سرزمین کی اور یہ کام تکمیل کو پہنچا ان کی وفات کے بعد۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مصر میں بھی اس عذاب کے بعد، جو فرعون اور اس کی قوم پر آیا، وہ ارسٹوکریسی بالکل تباہ ہو گئی جو مصر پر قابض تھی اور ان کی جگہ دوسرے لوگ قابض ہو گئے جو خاندان اور روایات میں بالکل مختلف تھے اور ان کے ساتھ سابق حکمرانوں کی سیاسی رقابتیں بھی تھیں اور ان کی طرف سے یہ اندیشہ بھی فرعونیوں کو تھا کہ یہ بنی اسرائیل کے ساتھ ساز باز کر کے کہیں ملک کے حکمران نہ بن بیٹھیں۔ یہ مسئلہ چونکہ تاریخ کا ہے اور براہ راست ہم سے متعلق نہیں ہے اس وجہ سے ہم صرف اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

بنی اسرائیل کی بے اعتقادی

'قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا الایۃ' بنی اسرائیل پر، ان کی بے یقینی اور ضعیف الاعتقادی کے سبب سے

حضرت موسیٰ کی یہ تلقین بے اثر ہی رہی۔ وہ بولے کہ ہمارے دن تو سخت سے سخت ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب حالات و واقعات یہ ہیں جو پیش آئے یا پیش آ رہے ہیں تو تمہارے ان وعدوں اور تمہاری ان طفل تسلیوں پر کون جی سکتا ہے تم تو رحمت کے بجائے ہمارے لیے زحمت ہی زحمت بنتے جا رہے ہو! اوپر تورات کے حوالے سے ہم بیان کر آئے کہ مصر پر قابض ارسٹوکریسی بنی اسرائیل کی روز افزوں تعداد سے بہت گھبرائی ہوئی تھی اور اس کی روک تھام کے لیے اس نے ان کی نسل کشی کی مہم چلا رکھی تھی۔ بعد میں جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی تنظیم و اصلاح کی دعوت لے کر اٹھے تو ارباب اقتدار کی یہ گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کو ایک طاقتور لیڈر مل گیا ہے اور اب جلد وہ ایک منظم قوت بن کر ہمارے اقتدار کو چیلنج کر دیں گے۔ اس گھبراہٹ میں فرعون نے ایک طرف تو ان کی نسل کشی کی مہم کو مزید قوت و شدت کے ساتھ چلانے کے احکام جاری کر دیے دوسری طرف اپنے کارندوں، تحصیل داروں اور عمال کو یہ ہدایت کی کہ بنی اسرائیل سے جو بیگار لی جا رہی ہے وہ سخت سے سخت تر کر دی جائے۔ اینٹیں بنانے کے لیے جو بھس ان کو دیا جاتا رہا ہے وہ بند کر دیا جائے اور ان کو حکم دیا جائے کہ بھس بھی وہی بٹوریں اور اینٹیں بھی لازماً ہر شخص سے روزانہ اتنی ہی بنوائی جائیں جتنی اب تک وہ بناتے رہے ہیں۔ اس طرح عذاب کا وہ شکنجہ جو پہلے بھی کچھ کم سخت نہ تھا حضرت موسیٰ کے بعد اور بھی سخت ہو گیا۔ بنی اسرائیل نے یہ سب کچھ حضرت موسیٰ کے کھاتے میں ڈال دیا کہ یہ سب تمہاری برکتیں ہیں۔!

حضرت موسیٰ کی طرف سے تسلی

"قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ الایۃ" بنی اسرائیل کی مایوسی و بددلی دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے پھر ان کو تسلی دی کہ مایوس اور ہراساں نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو ہلاک کرے گا اور زمین میں تمہیں خلافت عطا فرمائے گا۔ یہاں زمین سے مراد مصر کی سرزمین نہیں ہے بلکہ جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ میں اس کی وضاحت ہوئی ہے اس سے مراد فلسطین کا علاقہ ہے۔ فرمایا وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا اور جو قوم دبا کے رکھی گئی تھی ہم نے اس کو اس سرزمین کے شرق و غرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے بڑی برکتیں رکھی تھیں، اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بسبب اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے) ظاہر ہے کہ 'بٰرَكْنَا فِیْهَا' سے جس علاقہ کی طرف اشارہ ہے وہ فلسطین ہی کا علاقہ ہے اور اس آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ اسی علاقہ کی حکومت دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ وعدہ پورا کیا جو آیت زیر بحث میں حضرت موسیٰ کی زبانی مذکور ہے

استخلاف کا اصل مقصد

"فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ" یہ استخلاف فی الارض کے اصل مقصد کی یاددہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو مٹاتا اور دوسری کو عروج و اقبال بخشتا ہے تو صرف یہ دیکھنے کے لیے کرتا ہے کہ اقتدار کی وراثت پا کر یہ قوم کیا رویہ اختیار کرتی ہے، یہ بھی پچھلی قوم کی طرح بدمست ہو کر زمین میں فساد مچاتی ہے یا اس خلافت و وراثت کا حق

پہچانتی اور اس کو ادا کرتی ہے۔ اگر یہ بھی اسی روش پر چل نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ایک خاص مدت تک مہلت دے کر فنا کر دیتا ہے اور ان کی جگہ دوسروں کو دے کر ان کو آزماتا ہے۔ امتحان کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے، برابر جاری رہے گا۔ اس وجہ سے کسی قوم کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب وہ ایک مرتبہ خدا کی محبوب بن گئی تو ہمیشہ محبوب ہی بنی رہے گی، خواہ اس کے اعمال و عقائد میں کتنی ہی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۱۳۰)

'سِنِيْنَ'، سنۃ کی جمع ہے۔ اس کے عام معنی تو سال کے ہیں لیکن یہ قحط اور مصیبت کے سال کے لیے بھی معروف ہے اور اسی مفہوم میں یہاں یہ استعمال ہوا ہے۔

سنتِ الٰہی کا ظہور

اوپر آیت ۹۴-۹۵ کے تحت ہم اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جب وہ اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کی دعوت کے مویدات، مختلف قسم کی آزمائشوں کی شکل میں، وہ آفاق و انفس میں بھی ظاہر فرماتا ہے تاکہ لوگوں کے کان رسول کی دعوت کے لیے کھلیں، وہ عبرت پکڑیں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ اسی سنتِ الٰہی کی طرف یہاں اشارہ فرمایا کہ ایک طرف موسیٰؑ نے اپنی دعوت بلند کی اور اپنے معجزات سے فرعونیوں کو جھنجھوڑا، دوسری طرف ہم نے قوم فرعون کو قحط اور پیداوار کی کمی کی آزمائشوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے اندر خدا کا خوف اور اس کی یاد بیدار ہو۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۳۱-۱۳۲)

'طیر' کا مفہوم

'تطیر' 'طیر' سے ہے۔ 'طیر' چڑیوں اور پرندوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ قوموں پرستوں میں چڑیوں کے اڑنے سے فال لینے کا عام رواج ہے اس وجہ سے 'تطیر' کا لفظ فال لینے کے معنی میں استعمال ہوا۔ پھر اس کا غالب استعمال فالِ نحس کے معنی میں ہو گیا۔ اسی مادے سے 'طائر' کا لفظ بھی ہے جو اس چیز کے لیے استعمال ہوا جس سے کوئی نیک یا بد فال لی جائے اور پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے حظ، قسمت اور نصیبہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

آفات پر فرعونیوں کا ردِ عمل

اب یہ بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو آزمائشیں فرعونیوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے بھیجیں کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں انھوں نے ان کو حضرت موسیٰؑ کی نحوست کا نتیجہ قرار دیا۔ جب حالات سازگار ہوتے تو اس کو اپنی خوش بختی، بلند اقبالی اور اپنے استحقاق کی برکت قرار دیتے لیکن جب کسی ارضی و سماوی آفت سے دوچار ہوتے تو کہتے کہ یہ موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے۔ یہ جو بے دینی و بے عقیدگی پھیلا رہے ہیں اس سے ارضی و سماوی دیوتا ناخوش ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ ان آفتوں کی شکل میں سامنے

آرہا ہے۔ فرمایا کہ ان کا طائر قسمت و نحوست ہے تو خدا کے پاس اور یہ پیدا ہوا ہے ان کی اپنی ہی بداعمالیوں سے لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت سے ناواقف ہے اس وجہ سے وہ اپنی نحوست دوسروں کے طالع میں ڈھونڈھ رہے ہیں۔

'وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا' یہ ان کا حتمی جواب نقل ہوا ہے کہ خواہ ہم پر جادو چلانے کے لیے تم کتنی ہی نشانیاں دکھاؤ ان چیزوں سے مرعوب ہو کر ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۱۳۳-۱۳۵)

حضرت موسیٰ کے معجزات

اوپر آیت ۱۳۰ میں جن آزمائشوں کا ذکر ہوا ہے، یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس عام سنت الٰہی کے تحت ظہور میں آئیں جو ہر رسول کی دعوت کی تائید و تقویت اور لوگوں کے اندر تضرع اور تذکر پیدا کرنے کے لیے رحمت الٰہی کا مقتضیٰ ہیں لیکن جب فرعونی ان سے اثر پذیر نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ہاتھوں نہایت اہم معجزات دکھائے جن میں سے چند کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ ہم تورات کی روشنی میں اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

'طوفان'

'طُوْفَان'۔ تورات میں اس طوفان کی تفصیل اس طرح آئی ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ سب ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے اولے گریں اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملک مصر پر اولے برسائے پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملک مصر میں ان کو جو میدان میں تھے، کیا انسان کیا حیوان، سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے اور میدان کے سب درختوں کو توڑ ڈالا۔" خروج باب ۹ ۲۲-۲۵

اس سے معلوم ہوا کہ یہ طوفان رعد، گرج، کڑک اور اولوں کا طوفان تھا۔ بارش اور ہوائے تند بھی اکثر اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس میں آگ کا جو ذکر ہے یہ تورات کے مترجموں کی غلطی ہے۔ اس سے مراد ہماری عام آگ نہیں ہے بلکہ یہ وہ بجلی ہے جو اس طرح کے طوفان کے لوازم میں سے ہے۔

ٹڈیاں

'جراد'، جراد ٹڈی کو کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل تورات میں یوں آئی ہے۔

"تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی

سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ ان کے بعد پھر آئیں گی کیونکہ انھوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انھوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی۔" خروج باب ۱۰ - ۱۵۔

جوئیں

'قمل' کے معنی ہیں جوئیں۔ یہ آفت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"تب خداوند نے موسیٰ سے کہا، ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مار تاکہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہو گئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔" خروج ب ۱۶ - ۱۷

مینڈک

'اَلضَّفَادِعُ' 'ضفادع' ضفدع کی جمع ہے۔ 'ضفدع' مینڈک کو کہتے ہیں۔ اس عذاب کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اس سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے کہ میری عبادت کریں۔ اور اگر تو ان کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آ کر تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور تیرے آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے۔ اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔" خروج ب ۱ - ۶

خون

'دَمٌ' کے معنی خون کے ہیں۔ اس کے ظہور کی شکل اس طرح مذکور ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے یعنی دریاؤں، اور نہروں اور جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ وہ خون بن جائیں اور سارے ملک مصر میں پتھر اور لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہی خون ہو گا اور موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا۔ اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا

پانی سب خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی نہ پی سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہو گیا۔" خروج ۷: ۱۹-۲۱

'اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ' یعنی یہ تمام نشانیاں تفصیل سے مذکور ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'مُفَصَّلٰتٍ' کا ظرف یہاں محذوف ہے۔ یعنی ان کی تفصیل تورات میں موجود ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اسی ذیل کے چند اور معجزات بھی تمام جزئیات کی تفصیلات کے ساتھ تورات میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان کی طرف چونکہ صرف اشارہ کیا ہے اس وجہ سے ان کی تفصیلات کے لیے حوالہ تورات کا دے دیا ہے۔

'فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ' یعنی بجائے اس کے کہ ان سے ان کے اندر تضرع اور تذکر پیدا ہوتا ان کے غرور اور تکبر میں اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مجرم لوگ تھے اور اللہ تعالیٰ مجرموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ان کے لیے نشانیاں ہدایت کے بجائے صرف اتمام حجت اور قساوت قلب کا باعث بنتی ہیں۔

بار بار عہد اور بار بار عہد شکنی

'لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ الاٰية' ۔ 'لَمَّا'، 'كُلَّمَا' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ خاص طور پر ان مواقع میں جہاں مدنظر تصویر حال ہو۔ آگے آیت ۱۰۹ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب جب وہ عذاب کی گرفت میں آتے حضرت موسیٰ کی منت سماجت کرنے لگتے کہ اس قرب و تعلق کی بنا پر جو تمھیں اپنے رب سے ہے، ہمارے لیے دعا اور سفارش کرو کہ یہ عذاب ہمارے سر سے ٹل جائے، اگر تم نے اس کو ٹال دیا تو ہم ضرور تمھاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دیں گے لیکن جب عذاب ٹل جاتا تو اپنے وعدے سے پھر جاتے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہے۔

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلا کر کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کر دے اور میں ان لوگوں کو جانے دوں گا تا کہ وہ خداوند کے لیے قربانی کریں۔"

(خروج ۸: ۸)

"فرعون نے کہا میں تم کو جانے دوں گا تا کہ تم خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو لیکن تم دور مت جانا اور میرے لیے شفاعت کرنا .... پر فرعون نے اس بار بھی اپنا دل سخت کر لیا اور ان لوگوں کو جانے نہ دیا۔"

(خروج ۸: ۲۸-۳۲)

'بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ' کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ چونکہ خدا تمھاری بات سنتا اور تمھاری دعا کی حرمت قائم رکھتا ہے اس وجہ سے ہمارے لیے دعا کرو۔

'اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ' سے مقصود ان کی بے ضمیری اور ان کے سفلہ پن کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے فریب اور جھوٹ پر زیادہ دیر تک پردہ نہ پڑا رہ سکے گا، وہ محض اس خیال سے جھوٹا عہد کر لیتے کہ اس سے جتنی دیر کے لیے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اٹھا لیا جائے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ۝ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ (۱۳۶-۱۳۷)

'فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ الایۃ'۔ اس انتقام سے مراد ان جرائم کا انتقام ہے جن پر پورے پورے اتمام حجت کے باوجود وہ جمے رہے۔ اللہ کی آیات سے اول تو وہ بے پروا اور غافل رہے اور جب وہ کھلے ہوئے چیلنج کے ساتھ ان کے سامنے ظاہر ہوئیں تو انھوں نے ان کی تکذیب کر دی کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ سحر و شعبدہ کا کرشمہ ہیں۔ اس کی پاداش میں وہ سمندر میں غرق کر دیے گئے۔ اس واقعۂ غرق کی تفصیلات کے لیے موزوں مقام ہماری اس کتاب میں آگے آئیں گے۔

بنی اسرائیل کو ان کے صبر کا صلہ

'وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ الایۃ'۔ 'یُسْتَضْعَفُوْنَ' سے اشارہ ان مظالم و شدائد کی طرف ہے جو بنی اسرائیل کو دبائے رکھنے کے لیے فرعونیوں کے ہاتھوں ان پر ڈھائے گئے اور جن میں سے بعض چیزوں کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ وہی قوم جو غلامی و محکومی کے نہایت سخت شکنجوں میں کسی ہوئی تھی اللہ نے اس کو رفعت بخشی اور اس کو سرزمین فلسطین کی حکومت عطا فرمائی۔ اس حکومت بخشنے کے لیے یہاں 'ایراث' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ان کے سابق حکمرانوں کو اللہ نے وہاں سے ہٹایا اور ان کو ان کی وراثت دلائی۔ اس سرزمین کی تعریف میں 'اَلَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا' کے جو الفاظ وارد ہیں اول تو وہ یہ متعین کرتے ہیں کہ اس سے مراد فلسطین ہی کی سرزمین ہے اس لیے کہ قرآن میں اس صفت کے ساتھ اسی سرزمین کا ذکر ہوا ہے۔ دوسرے یہ الفاظ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی برکتوں کو ظاہر کر رہے ہیں اس لیے کہ عربی میں 'مُبَارَك' کا لفظ ان دونوں ہی مفہوموں کا حامل ہے۔

'مَشَارِق' اور 'مَغَارِب' کے الفاظ سے اس حکومت کے وسیع الاطراف ہونے کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ عربی میں بعض مرتبہ کسی لفظ کی جمع اس کے اطراف کی وسعت کے لحاظ سے بھی آتی ہے۔ پیچھے لفظ 'اعراف' پر بحث کرتے ہوئے ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

'وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ' سے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر آیات ۱۲۸-۱۲۹ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے آبا و اجداد سے کیا تھا اور جس کی تجدید بالآخر موسیٰؑ سے فرمائی وہ وعدہ بالآخر پورا ہوا۔

'بِمَا صَبَرُوْا' سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوتے ہیں وہ بہرحال اوصاف و کردار پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ مجرد خاندان و نسب کسی کو خدا کا چہیتا بنا دے۔

قوم فرعون کی تباہی

'وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ' یعنی فرعون اور اس کی قوم کی تمام شاندار تعمیرات بھی ہم نے برباد کر دیں اور ان کے سرسبز و شاداب باغات بھی اجاڑ دیے۔ یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں 'مَا كَانَ یَصْنَعُ' اور 'مَا

کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ، میرے نزدیک پہلے سے تعمیرات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے سے باغات کی طرف۔ جس فرعون کا یہاں ذکر ہے اس کو تعمیرات سے خاص ذوق رہا ہے اور بنی اسرائیل زیادہ تر انہی تعمیرات کی خاطر دن رات بیگار میں جتے رہتے تھے۔ 'مَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ' سے اصلاً تو انگور کے باغ مراد ہیں اس لیے کہ انہی کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، جیسا کہ قرآن میں 'جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ' کی ترکیب موجود ہے، لیکن بسا اوقات کسی چیز کی تعبیر اس کے جزو غالب سے کی جاتی ہے جو باعتبار لفظ تو خاص ہوتی ہے لیکن مراد اس سے عام ہوتی ہے۔ مصر کو، کم از کم اس دور میں انگور کی پیداوار میں امتیاز حاصل رہا ہے۔ سورۂ یوسف کے بعض مقامات سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے۔

اس ٹکڑے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ قومِ فرعون پر غرق کے علاوہ بھی تباہی آئی جس سے ان کے شہر اور باغ سب اجڑ گئے۔ ان کے باغ تو، جیسا کہ اوپر گزرا، پہلے ہی اولوں اور ٹڈیوں سے تباہ ہو چکے تھے معلوم ہوتا ہے کوئی زلزلہ بھی اسی دوران میں آیا جس سے ان کی عمارتیں بھی منہدم ہو گئیں اور جو کچھ پچھلی آفتوں سے بچ رہا تھا وہ بھی برباد ہو گیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۱۳۸ - ۱۴۰)

'وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ' الایۃ۔ اس اسلوب میں جو بلاغت ہے اور بنی اسرائیل کے لیے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہتمام و عنایت کی جو شان ہے اس کی طرف ہم بقرہ آیت ۵۰ کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

بنی اسرائیل کی سرگزشت مصر سے نکلنے کے بعد

یہاں تک بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہوا جو مصر اور فرعون سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں ظاہر ہوئی ہیں اور اس نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی جس طرح مدد فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو جس طرح ہلاک کیا وہ سب سامنے آ گیا اور اس پہلو سے یہ سرگزشت ان سرگزشتوں کا تکملہ اور تتمہ بن گئی جو اس سورہ میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اب آگے بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہو رہا ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر لینے کے بعد کا ہے۔ اس حصہ سے یہ حقیقت نمایاں ہو گی کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر بنی اسرائیل کی مدد کی اور ان کی رہنمائی فرمائی لیکن بنی اسرائیل نے ہر قدم پر ناشکری کی اور ٹھوکر کھائی۔

'فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ' یہاں لفظ 'قَوْم' سے ان قوموں میں سے کوئی قوم مراد ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا سے نکلنے کے بعد سابقہ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر قوم بت پرست تھی 'یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ' کا اسلوب بیان فی الجملہ ان کی تحقیر کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ایسے نابکار اور احمق تھے کہ خدائے رحمان و رحیم کو چھوڑ کر اپنے ہی ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں سے چمٹے ہوئے اور ان کی بندگی اور پوجا میں سرگرم تھے۔ لفظ 'عُکُوْف' جب 'عَلٰی' کے ساتھ آئے تو اس کے معنی کسی شے پر جم جانے اور اس سے اپنے آپ کو وابستہ

کر لینے کے آتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی پہلی ٹھوکر

'قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا' لیکن ان سے زیادہ احمق بنی اسرائیل نکلے کہ یہ تماشا دیکھتے ہی اس پر ریجھ گئے اور حضرت موسیٰ سے مطالبہ شروع کر دیا کہ جیسے دیوتا ان کے پاس ہیں ویسا ہی ایک دیوتا ہمارے لیے بھی بنا دے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی طویل غلامی نے بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی سطح اتنی پست کر دی تھی کہ خدا کے جمال و جلال کی اتنی شانیں دیکھنے کے بعد بھی وہ گویا ابھی مصر کی ظلمات ہی میں تھے۔ قدیم مالوفات سے وابستگی آسانی سے نہیں جاتی۔ شاید یہی نکتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد تمام آثار شرک یک قلم مٹا دینے کے احکام جاری فرما دیے کہ خام اور کمزور لوگوں کے لیے یہ چیزیں فتنہ نہ بن سکیں۔

'قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ' حضرت موسیٰؑ نے مطالبہ کے جواب میں فرمایا کہ تم لوگ بڑے ہی بے عقل، وہمی اور جذباتی ہو۔ 'اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ' یہ تو جو کچھ یہ کر رہے ہیں سب خدا کے ہاں بالکل برباد و پامال کر دیا جائے گا اس لیے کہ یہ یکسر باطل ہے۔ سوچو کہ اپنی ہدایت و شریعت کے لیے تمہارا انتخاب کر کے تمہیں ساری دنیا پر فضیلت و سرفرازی تو اللہ نے بخشی تو کیا اب میں اس کو چھوڑ کر تمہارے لیے کوئی اور معبود ڈھونڈنے نکلوں۔ اس سے بڑی ناشکری و ناسپاسی اور کیا ہو گی۔!!

دان کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ!

'وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ' اس آیت کی تفسیر بقرہ میں بھی گزر چکی ہے اور اس سورہ میں بھی۔ یہاں جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت سے لے کر آگے آیت ۱۴۴ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اہتمام کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو اپنی ہدایت و شریعت سے مشرف فرمانے کے لیے کیا لیکن اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل نے یہ قدر کی کہ ادھر حضرت موسیٰؑ طور پر اللہ کی شریعت لینے گئے ادھر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی تمام نصیحتوں اور ان کے خلیفہ حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے علی الرغم وہی بت ڈھال کر تیار کر دیا جس کے لیے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو وہ تنبیہ و ملامت فرمائی تھی جس کا ذکر اوپر گزرا۔ مقصود اس ساری تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ جو قوم آج اپنے شرف و تقدس پر اتنی نازاں ہے عین اپنے نبی کی موجودگی میں، اور اس کے عظیم معجزات کو دیکھتے ہوئے، کیا حرکتیں کر چکی ہے۔

'وَوٰعَدْنَا مُوْسٰي ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰي لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۴۲)

انبیاءؑ کی لغزش کی نوعیت

اس آیت کی وضاحت بقرہ کے تحت ہو چکی ہے۔ یہ اس اہتمام کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ وہ ۳۰ دن کے لیے کوہ طور کے ایک مخصوص مقام پر حاضر ہوں۔ حضرت موسیٰؑ، جیسا کہ طٰہٰ آیت ۸۴ کے تحت بحث آئے گی، وقت مقررہ سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ہر چند حضرت موسیٰؑ کی یہ سبقت رضائے الٰہی کی طلب کی راہ میں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس

عجلت و سبقت پر گرفت فرمائی اور اس کی حکمت تربیت مقتضی ہوئی کہ ۳۰ دن کی مقررہ مدت بڑھا کر ۴۰ دن کر دی جائے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع پر یہ واضح کریں گے کہ انبیاء علیہم السلام اتباع ہوا سے مغلوب ہو کر کبھی غلطی نہیں کرتے لیکن اتباع رضائے الٰہی کے جوش میں اگر کبھی کوئی قدم ان کا حدود سے ذرا متجاوز اٹھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی ان کو روک دیتا ہے اس لیے کہ وہ حق کی میزان ہوتے ہیں اور میزان کا ہر پہلو سے ٹھیک ہونا اور سو فی صدی ٹھیک ہونا ضروری ہے۔

حضرت موسیٰ کی ہدایت حضرت ہارونؑ کو

'وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ' یہ اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰؑ نے اپنی وقتی غیبت کے دوران بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے فرمایا۔ انھوں نے اپنی غیر حاضری کے زمانے کے لیے حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ بنایا اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ تم قوم کے اندر کوئی خرابی، کوئی بگاڑ اور کوئی بدعت و ضلالت نہ پیدا ہونے دینا۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز رونما ہو تو اس کی اصلاح کرتے رہنا اور ہرگز ہرگز بگاڑ پیدا کرنے والوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ 'وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ' کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قوم کے اندر جو عناصر فساد تھے حضرت موسیٰؑ ان سے آگاہ تھے اور ان کی طرف سے ان کی پچھلی کارستانیوں کے سبب سے ان کو اندیشہ بھی تھا اس وجہ سے انھوں نے حضرت ہارونؑ کو خاص تاکید کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر یہ عناصر کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش کریں تو اس کو چلنے نہ دینا —— یہ ملحوظ رہے کہ یہ سارا اہتمام اس لیے بیان ہو رہا ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ بنی اسرائیل نے اسی دوران میں گوسالہ پرستی کی جو لعنت اختیار کی تو اس سارے اہتمام کے علی الرغم اختیار کی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۴۳)

'مِیْقَات' کے معنی وقت مقررہ کے ہیں۔ یہاں 'مِیْقَاتُ' سے مراد وہ وقت خاص ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے خطاب و کلام سے مشرف کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔

انسان ناسوتی آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھ سکتا

'قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ'۔ کلام سے مشرف ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو شوق ہوا کہ جس کا کلام سامعہ نواز ہوا ہے اس کا دیدار بھی باصرہ نواز ہو۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ادب سے یہ درخواست کی کہ اے رب تو مجھے اپنے آپ کو دکھا کہ میں تجھے دیکھ لوں، یہ شوق ایک فطری شوق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اس پر ملامت نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ انسان ان ناسوتی آنکھوں سے خدا کی ذات کو نہیں دیکھ سکتا، صرف اس کی صفات کے مظاہر ہی کو دیکھ سکتا ہے۔

'وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ'۔ یہ مشاہدہ حضرت موسیٰؑ کی اطمینان دہانی کے لیے کرایا گیا کہ خدا کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جماد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البنیان ہو کر کس طرح لا سکو گے۔ انسان کی قوت برداشت

محدود ہے۔ اس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں لیکن یہ روشنی ایک حدِ خاص سے متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے کان آواز کو سنتے ہیں لیکن ان کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے، بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو بہرے سے کان کے پردے ہی بے کار ہو جائیں۔ آفتاب اس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کی روشنی اور حرارت اسی وقت تک اس کے لیے حیات بخش ہے جب تک وہ نہایت ہی طویل فاصلے سے، نہ جانے کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ ارض سے قریب آکر اس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جاندار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابل میں انسان کی قوتِ برداشت اتنی ناتوان ہے تو وہ خدا کی ذات بحت کی تاب کس طرح لا سکتی ہے جو نورِ مطلق اور تمام چون و چگوں سے ماوراء اور بالاتر ہے۔ فرمایا کہ تم میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے، البتہ تم سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو، میں اس پر اپنی تجلی ڈالتا ہوں۔ اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ جائے تو تم سمجھنا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو، اگر نہ ٹکا رہ سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز تمہاری برداشت سے بدرجہا اولیٰ بالاتر ہے۔

'فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا' دك الحائط، هدمه حتى سواه بالارض، 'دك الارض' سوّیٰ صعودها و هبوطها۔ 'دك الحائط' 'دك الارض' کے معنی ہوں گے دیوار کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا یا زمین کے تمام نشیب و فراز برابر کر دیے۔

'جبل' سے مراد یہاں پورا پہاڑ اور پورا سلسلۂ کوہ نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خاص حصہ یا حضرت موسیٰ کے سامنے کی کوئی مخصوص چوٹی ہے۔ کُل بول کر جزو مراد لیا ہے۔ جیسا کہ ہر زبان میں معروف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جب پہاڑ کے مخصوص حصے پر اپنی تجلی ڈالی تو پہاڑ پاش پاش ہو کر منہدم ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہ تجلی ذات کا محض ایک پرتَو اور ایک شمہ ہی رہا ہو گا لیکن پہاڑ جیسی جامد چیز بھی اس کی تاب نہ لا سکی اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

'فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' جب حضرت موسیٰ ہوش میں آئے تو بولے کہ 'سُبْحٰنَكَ' تو اس سے ارفع و منزہ ہے کہ تجھے ناسوتی آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ 'تُبْتُ اِلَيْكَ' میں نے یہ جسارت کی کہ تجھے دیکھنے کی خواہش کی۔ میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں 'وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' اور میں سب سے پہلا اس بات پر ایمان لانے والا بنتا ہوں کہ تیری ذات ہماری آنکھوں کے مشاہدے سے بالاتر ہے۔

بنی اسرائیل کی محسوس پرستی کا علاج

اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر حضرت موسیٰ کو یہ سب کچھ بنی اسرائیل کی ایک شدید عقلی بیماری کو دور کرنے کے لیے دکھایا۔ تورات میں متعدد مواقع پر یہ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے بار بار حضرت موسیٰ سے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کیا۔ وہ کہتے کہ خدا جب تم سے بات کرتا ہے تو ہم سے بھی رو در رو ہو کر بات کرے اور ہم اس کو دیکھیں

اللہ تعالیٰ کی وہ تمام شانیں جو انھوں نے اب تک دیکھی تھیں وہ ان کے دلوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہوئیں۔ ایک ان دیکھے خدا پر کسی طرح ان کا دل جمتا ہی نہ تھا۔ اوپر اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ کا جو مطالبہ ان کی طرف سے مذکور ہے وہ بھی ان کی اسی خواہش کا مظہر ہے کہ وہ خدا کو ایک پیکرِ محسوس میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی اس محسوس پرستی کی بیماری کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت موسیٰؑ کو واضح طور پر بتا اور دکھا دیا کہ خدا آنکھوں سے دیکھنے اور ہاتھوں سے چھونے کی چیز نہیں ہے، صرف عقل سے سمجھنے اور دل سے ماننے کی چیز ہے۔ آنکھیں صرف اس کی صفات کے جلوے دیکھ سکتی ہیں۔ اس سے آگے ان کی رسائی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ ساری باتیں بنی اسرائیل کو سمجھائیں لیکن یہ کھٹک ان کے دلوں سے گئی نہیں چنانچہ اس کی وجہ سے وہ خدا کے عتاب میں بھی آئے جس کا ذکر بقرہ میں بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔

اس مقام سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جن جوگیوں اور صوفیوں نے مشاہدۂ ذاتِ الٰہی کو معرفت کا درجۂ کمال قرار دیا ہے اور اس کو اپنا نصب العین بنایا ہے انھوں نے اپنا گول اپنی رسائی کے حدود سے بہت آگے بڑھ کر باندھا ہے اور اس کا حاصل حیرگی اور تحیر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ مگس شہباز کے شکار کے لیے نکلے۔ ہم سورۂ نجم کی تفسیر میں انشاء اللہ بتائیں گے کہ اوروں کا کیا ذکر سب سے زیادہ عالی مقام اور صاحب قرب حضرت جبرئیل ہیں لیکن ان کی رسائی کی بھی ایک حد مقرر ہے، وہیں سے وہ انوار و تجلیات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، اگر ذرا اس سے آگے قدم بڑھائیں تو

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

جو بخشا گیا اس پر قناعت کرو

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے پیغام اور اپنے کلام سے تم کو لوگوں پر جو برگزیدگی بخشی ہے تمھارے شرف کے لیے یہی بس ہے، میں نے جو تعلیم و ہدایت تمھیں عطا فرمائی ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور برابر میرے شکر گزار رہو۔ یعنی اس کا حق ادا کرو، خود بھی دل و جان سے اس کی قدر کرو، دوسروں کو بھی یہ بتاؤ اور سکھاؤ۔ انداز کلام سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقہ سے نکلتی ہے کہ جو عطا ہوا ہے تمھارے لیے یہی بہت ہے اس پر قناعت کرو۔ میرے دیدار کی خواہش نہ کرو۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۚ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ (۱۴۵)

الواح سے متعلق تورات کی دو مختلف روایتیں

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ: تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا؟ تورات سے دونوں باتیں نکلتی ہیں۔

"اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام ان کو بتا دیے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے اور موسیٰؑ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں۔" (خروج ب۲۴ ۳-۴)

دوسرے مقام میں اس طرح ہے۔

"اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے اور ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا وہ بھی خدا ہی کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا" خروج ب۳۲ ۱۵-۱۶

قرآن کے الفاظ دونوں معنوں کو محتمل ہیں اور اصلاً دونوں میں کوئی فرق ہے بھی نہیں۔ جب حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت لکھا تو یہ اللہ تعالیٰ ہی نے لکھا۔ ایک پل کی تعمیر ایک انجینیر کرتا ہے لیکن بادشاہ یا حکومت کے حکم اور اس کے منصوبہ اور نقشہ کے تحت کرتا ہے۔ اس لیے کہا یہ جاتا ہے کہ بادشاہ یا حکومت نے پل بنایا۔ قرآن کی حفاظت کا تمام اہتمام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے ہاتھوں عمل میں آیا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت عمل میں آیا اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ 'وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ' اور ہم ہی ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

بنی اسرائیل کے لیے تعلیم بالقلم کا اہتمام

یہ الفاظ اس اہتمام و عنایت خاص کو ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت دینے کے معاملے میں فرمائی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو زبانی تعلیم دی لیکن بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا۔ ان کے پیغمبر نے صرف قول و عمل ہی سے ان کو نہیں بتایا اور سکھایا بلکہ ان کے لیے سب کچھ قلم بند بھی کر دیا کہ اللہ کی شریعت ان کو سب سے زیادہ محفوظ و مامون شکل میں ملے لیکن اس اہتمام کی جو قدر انھوں نے کی اس کی تفصیلات بقرہ میں بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آ رہی ہیں۔

الواح میں مندرج تفصیلات کی نوعیت

'مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ' یعنی ان الواح میں ہر قسم کی ضروری ہدایات بھی تھیں اور تمام ضروری تفصیلات بھی۔ 'مِنْ كُلِّ شَیْءٍ' اور 'لِّكُلِّ شَیْءٍ' اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو اس کا تعلق پیش نظر مقصد و موضوع ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی اس مرحلہ میں دین و شریعت کی جو باتیں بتانی مدنظر تھیں وہ ساری باتیں بھی بتائی گئیں اور جماعتی تنظیم و تشکیل سے متعلق جو تفصیلات درکار تھیں وہ بھی درج الواح ہوئیں۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ الواح میں صرف مشہور احکام عشرہ ہی درج ہوئے لیکن یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوپر ہم نے کتاب خروج سے جو حوالے نقل کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تختیاں دو تھیں اور دونوں اپنے دونوں جانب سے بھری ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں تورات کے مذکورہ مقام پر بہت سی دوسری تفصیلات بھی ہیں جو جماعتی تنظیم و تشکیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی نوعیت ایسی ہے کہ اس مرحلہ میں بنی اسرائیل

کو ان سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔ پھر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے تورات کی طرح صرف دو ہی تختیوں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ 'اَلْوَاحٌ' کا لفظ استعمال کیا ہے جو جمع کے لیے آتا ہے اور عربی میں جمع کا اطلاق دو سے زیادہ پر ہوتا ہے۔

صیغۂ تفضیل کا ایک خاص محل

'خُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا' اس کو مضبوطی سے پکڑو یعنی پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو اختیار کرو اور ہر طرح کے حالات میں، خواہ نرم ہوں یا سخت، اس کی ہدایات پر جمے رہو اور اپنی قوم کو بھی ہدایت کرو کہ دوسری جاہل قوموں کی ریس میں ان کے جیسے بتوں کی فرمائش نہ کرے اور نہ ان کے طور طریقے اختیار کرے بلکہ اس سے بہتر طریقے کو اپنائے جو اس نوشتہ میں بتایا گیا ہے۔ 'بِاَحْسَنِهَا' میں جو تقابل و تفاضل ہے وہ نوشتۂ الواح کی مختلف ہدایات میں نہیں ہے اس لیے کہ وہ تو ساری کی ساری احسن بھی تھیں اور سب بلا استثناء انتخاب اختیار کرنے کے لیے بھی تھیں بلکہ بہ ترجیح مشرک قوموں کے اس طور طریقے کے مقابل میں ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا پار کرنے کے بعد سابقہ پیش آیا اور جن سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے وہ مطالبہ پیش کر دیا جس کا ذکر اوپر آیت ۱۳۸ میں گزرا۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ بت پرست قوموں کی خرافات پر نہ ریجھیں بلکہ اس پاکیزہ اور اعلیٰ و احسن طریقہ کو اپنائیں جو ان الواح میں ان کو بتایا گیا ہے۔ تفضیل کا صیغہ اس مفہوم کے لیے قرآن میں بعض دوسرے مواقع میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورۂ زمر آیت ۵۵ میں انشاء اللہ کسی موزوں مقام میں ہم اس کی مزید تفصیل بیان کریں گے۔

آگے کے مراحل کے لیے بدرقہ

'سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ' یہ آگے کے مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ان تعلیمات و ہدایات کو مضبوطی سے پکڑنا تمھارے اور تمھاری قوم کے لیے، اس واسطے بھی ضروری ہے کہ آگے تمھیں کفار و فساق کے علاقوں سے گزرنا اور ان سے سابقہ پیش آنا ہے۔ کفر و فساد کے ان علاقوں میں یہی چیزیں تمھارے لیے بدرقہ اور زادِ راہ کا کام دیں گی اور انھی کے ذریعہ سے تم غالب اور فتحمند رہو گے۔ ان سے مسلح رہے بغیر تمھاری قوم کے لیے ہر قدم پر فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۴۶-۱۴۷)

ایک برسرِ موقع تنبیہ

یہ برسرِ موقع ایک جامع تنبیہ و تذکیر ہے کہ کون لوگ ان تعلیمات کی قدر کریں گے، ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کون ان سے منہ موڑیں گے اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی محرومی سے دوچار ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی زمین میں رہتے بستے اپنے آپ کو خدا سے بے نیاز، اس کے امر و حکم سے اپنے آپ کو بالاتر، اور اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنا استحقاقِ ذاتی سمجھیں گے، اللہ ان کو ان ہدایات کی طرف مائل ہونے کی توفیق نہیں دے گا

ایسے لوگوں کے اندر خیر اور ہدایت کی رغبت مردہ ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کو ہدایت کی راہ دکھائی جائے تو وہ اس سے بھاگتے ہیں اور اگر گمراہی کی راہ کی دعوت دی جائے تو اس پر فوراً چل پڑتے ہیں۔ ان کی یہ حالت نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ وہ خدا کی نشانیوں سے بے پروا زندگی گزارتے ہیں اور واضح سے واضح بات بھی ان کے سامنے آئے تو اس کو جھٹلا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اللہ کی آیات اور آخرت کی ملاقات کے جھٹلانے والے ہیں، ان کے سارے اعمال اکارت اور بے ثمر ہو کے رہ جائیں گے۔ آخرت میں صرف اس عمل کی قدر و قیمت ہے جو خدا کی رضا کے لیے آخرت کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۱۴۸)

اس سارے اہتمام کی نبی اسرائیل کی طرف سے قدردانی

یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کی ہدایت کے لیے یہ کچھ جتن کیے جو مذکور ہوئے لیکن انھوں نے اس کی قدر یہ کی کہ حضرت موسیٰؑ کے جانے کے بعد ایک بچھڑے کی مورت بنا کر اس کی پوجا پاٹ میں لگ گئے۔

'مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ' اس مورت کو بنانے کے لیے تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے سونے کے زیورات چندہ میں دیے۔ انھی زیورات سے بچھڑے کی ایک مورت بنائی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ صنعت گری یہ کی گئی کہ اس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح بچھڑے ڈکرتے ہیں، اس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی۔ 'خُوَار' عربی میں بیل کے ڈکرنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

قرآن نے یہ ساری تصریح بنی اسرائیل کی بلادت، عقلی بے مایگی اور ساتھ ہی ان کی ناقدری و ناسپاسی ظاہر کرنے کے لیے کی ہے کہ جس خدا نے بے ہتا و بے مثال نے ان کو اپنے جلال و جمال کی وہ شانیں دکھائیں جو اوپر مذکور ہوئیں اس کی قدر انھوں نے یہ کی کہ اپنے ہی زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا، بچھڑا بھی کوئی سچ مچ کا نہیں بلکہ صرف ایک جسد، ایک قالب، ایک دھڑ، جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی اور اس کے متعلق یہ باور کر لیا کہ یہی وہ خداوند خدا ہے جو بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر لایا اور یہی اپنی رہنمائی میں بنی اسرائیل کو ارض موعود کی بادشاہی دلائے گا!! اس طرح انھوں نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے ان کے طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو ڈانٹ بتائی تھی۔

سامری کا فتن

تورات والوں نے تو یہ سارا فتنہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن قرآن نے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اس کی شدت کے ساتھ تردید کی ہے اور اس سارے فساد کا ذمہ دار، جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں آئے گا، سامری کو قرار دیا ہے جو بڑا ہی شاطر اور کیا دماغ تھا اور محض اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے حضرت موسیٰؑ کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو مصر وغیرہ کی بت پرستی اور صنعت گری سے واقف ہو ایک ایسا بچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلے۔ مندروں کے پجاریوں

اور پروہتوں نے عوام فریبی کے لیے ہر دور میں، ایسے ایسے عجائب اور کمالات دکھائے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس سے بھی کہیں زیادہ عجیب چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ جہاں بت پرستی ہو قدرتی طور پر وہاں بت گری کا فن بھی بہت ترقی کر جاتا ہے۔ مصر کے اسوان بند کی تعمیر کے سلسلہ میں ابوسمبل کا قدیم اور عظیم مندر جو بین الاقوامی اہتمام میں اپنی جگہ سے منتقل کیا گیا ہے، ایک انگریزی مجلے میں اس کی تفصیلات کے مطالعے کا مجھے موقع ملا۔ میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ مندر میں بادشاہ (فرعون) اور ملکہ کے اسٹیچو ایسے زاویے سے نصب کیے گئے تھے کہ سال میں جو تاریخ بادشاہ کی ولادت کی ہوتی اس دن سورج کی پہلی کرنیں بادشاہ کی پیشانی پر پڑتیں۔ اب غور کیجیے کہ جو بادشاہ سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا ہو عوام کالانعام کے دلوں میں اس کی خدائی کا سکہ جمانے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی؟

الغرض سامری کے لیے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس طرح کا کوئی بچھڑا بنا لینا کوئی مشکل کام نہ تھا، جس سے بچھڑے کی سی آواز نکلے لیکن اس نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ عوام فریبی کے لیے اس نے ایک مکاشفہ اور ایک خاص کرامت کا بھی ڈھونگ رچایا جس سے اس کا رنگ عوام پر خوب جم گیا۔ یہاں اشارے پر کفایت کیجیے، سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں انشاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

معبود کی ضرورت

'اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا' یہ بات کے بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ ذرا نہ سوچا کہ جو نہ بات کر سکتا نہ رہنمائی کر سکتا آخر وہ کس مرض کی دوا ہے کہ اس کو معبود مان کر اس کی پرستش کی جائے۔ معبود کوئی کھلونا نہیں ہے بلکہ اس سے زندگی کی سب سے بڑی ضرورت وابستہ ہے کہ وہ رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اس پہلو سے ایک چیز کا وجود بے معنی ہے تو اس کو معبود کیوں مانیے اور اس کی عبادت کیوں کیجیے۔

'اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِیْنَ' یہ اصل بات کا حصہ ہے۔ یعنی وہ بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۱۴۹)

بعد از وقت تنبہ

'سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ'۔ عربی زبان کا محاورہ ہے جس کے معنی عام طور پر نادم اور خجل ہونے کے کیے گئے ہیں لیکن ندامت و خجالت کا لازم چونکہ غلطی پر متنبہ ہونا بھی ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ متنبہ ہونا کیا جائے تو میرے نزدیک غلط نہ ہوگا۔ اس محاورے کی اصل کیا ہے؟ اس بارے میں اہل لغت کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اس بات کا کہ ہر محاورے کی اصل کی تحقیق ہے بڑا مشکل کام۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ کسی چیز کا ہاتھ میں گرایا جانا گویا اس کا سامنے آجانا ہے ایسی حالت میں ایک غبی بھی اس پر متنبہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ہاتھ کنگن کے لیے آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر یہ توجیہ صحیح مان لی جائے تو مطلب یہ ہوا کہ سامری اور

اس کے ساتھیوں کے پروپگنڈے سے مسحور ہو کر بنی اسرائیل یہ حماقت کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن سامنے جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا نظر آیا اور معلوم ہوا کہ یہ بنی اسرائیل کا خدا برآمد ہوا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ان کو اپنی حماقت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور بولے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارے اس جرم کو معاف نہ کیا تو ہم تو نامراد ہوئے۔

قرینہ دلیل ہے کہ یہ احساس ان لوگوں کو ہوا جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ موجود تھی۔ عوامی جوش کے بحران میں تو وہ صحیح صورت حال کا اندازہ نہ کر سکے لیکن جب نتیجہ سامنے آ گیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے دیکھا کہ یہ تو معاملہ بہت ہی خراب ہو گیا ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس طرح کے مواقع بڑی ہی آزمائش کے اور بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ کوئی ایک شیطان اٹھتا ہے اور جذباتی عوام کی بھیڑ اپنے اردگرد جمع کر کے کوئی ایسا فتنہ اٹھا دیتا ہے جس سے پوری جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور بسا اوقات سمجھ دار اور ذمہ دار لوگ بھی اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۠ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۠ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۱۵۰-۱۵۱)

حضرت موسیٰؑ پر رحمتِ حق کا غلبہ

تورات اور قرآن دونوں ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو پہاڑ ہی پر اس حادثہ کی اطلاع مل چکی تھی بلکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ ہی نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھی چنانچہ جب وہ پلٹے ہیں تو نہایت غصہ اور غم و افسوس کی حالت میں پلٹے ہیں۔ غصہ ان کو مفسدین کی اس کامیاب شرارت پر تھا اور غم و افسوس اپنی قوم کی نادانی و جہالت پر۔ آتے ہی انھوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی جن پر ان کی غیر موجودگی میں قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی کہ قوم کو اس برے راستے پر ڈالا یا جانے دیا۔

'اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ' یعنی قبل اس کے خدا یہ بتائے کہ اس کی عبادت کا کیا طریقہ ہے کیا! اور یہی بتانے کے لیے اس نے مجھے پہاڑ پر بلایا) تم نے سبقت کر کے خود عبادت کا ایک طریقہ ایجاد کر لیا حالانکہ یہ چیز تمھارے ایجاد کرنے کی نہیں بلکہ خدا ہی کے بتانے کی تھی۔ استفہام یہاں سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ بت پرستی دراصل عقیدۂ حلول کے تحت وجود میں آئی ہے۔ مشرکین سمجھتے ہیں کہ خدا ان صورتوں اور مورتوں میں حلول کر جاتا ہے اس وجہ سے ان کی عبادت خدا کی عبادت کے ہم معنی ہے۔ آگے اسی سورہ میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث آئے گی۔

'وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ' یہ ان کے غلبۂ حال اور جوشِ حمیت کی تصویر ہے کہ تختیاں تو انھوں نے

ایک طرف ڈال دیں اور حضرت ہارونؑ کا سر اور شانہ پکڑ کر ان کو جھنجھوڑنے لگے، مطلب یہ کہ یہ کیا ہوا؟ تم نے اس فتنہ کو کیوں سر اٹھانے دیا؟ چونکہ اصل ذمہ داری حضرت ہارونؑ ہی پر تھی اور ان پر پورا پورا اعتماد بھی تھا اس وجہ سے وہ سب سے زیادہ عتاب کی زد میں آئے۔ اللہ کے معاملے میں یہ جوش و جذبہ غیرتِ ایمانی کا بھی تقاضا ہے اور حضرت ہارونؑ کے ساتھ قلبی محبت کا بھی۔

حضرت ہارونؑ کی طرف سے صفائی

'قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ' یہ حضرت ہارونؑ نے اپنی صفائی پیش فرمائی ہے اور اندازِ خطاب بہت پیارا ہے۔ 'یَا اَخِیْ' نہیں کہا بلکہ 'ابن امّ' اے میرے ماں جائے، کہا جس سے شفقت اور استمالت دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ حضرت ہارونؑ نے صفائی میں فرمایا کہ قوم نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں۔ اس سے واضح ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس فتنہ سے لوگوں کو روکا بلکہ اس کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی لیکن قوم کی بھاری اکثریت سامری کے چکمے میں آ گئی اور خود ان کے ساتھ اتنی قلیل تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے ان کے لیے اس کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اس وجہ سے انھوں نے، جیسا کہ دوسری جگہ بیان آئے گا، مصلحت اسی میں دیکھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں کہ مبادا ان کا کوئی اقدام کسی مزید مضرت کا باعث ہو جائے۔ چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے۔ 'اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ' (میں ڈرا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا)

'فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ الایۃ' یعنی دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے ان ظالموں میں شمار نہ کر، یہ سارا فتنہ شریروں کا اٹھایا ہوا ہے، میں اس سے بالکل بری ہوں لیکن جب وہ دیکھیں گے کہ سارا عتاب مجھ پر ہوا تو وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوں گے کہ فتنہ تو انھوں نے اٹھایا اور ذمہ داری ساری مجھ پر آئی۔

حضرت ہارونؑ پر مرتبین تورات کے جھوٹ کی تردید

اس سے مرتبین تورات کے اس جھوٹ کی پوری پوری تردید ہو گئی جو انھوں نے حضرت ہارونؑ پر لگایا ہے کہ گوسالہ سازی کا یہ سارا کام حضرت ہارونؑ کے اہتمام میں انجام پایا۔ قرآن نے نہ صرف حضرت ہارونؑ کو اس ذلیل تہمت سے بری کیا بلکہ اس فتنہ کے اصل بانی کی بھی نشان دہی کی اور اس کے اس سارے ڈھونگ کو بھی بے نقاب کیا جو عوام فریبی کے لیے اس نے رچایا۔ اس کے موقع پر اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ آئے گی۔

'قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ الایۃ' حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کے اس عذر کو قبول کر لیا۔ حضرت ہارونؑ پر یہ شبہ تو کسی طرح ہو سکتا ہی نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ اس فتنہ کے بانیوں میں ہوں گے البتہ یہ شبہ حضرت موسیٰؑ کو ہوا ہو گا کہ انھوں نے اس کے روکنے کے لیے اپنی ذمہ داری کما حقہٗ ادا نہیں کی۔ حضرت ہارونؑ کے مذکورہ بالا جواب سے یہ شبہ دور ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ اپنا سر دے کر بھی اس فتنہ کو روک نہیں سکتے تھے تو ان کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس سے اپنے آپ کو الگ رکھیں اور حضرت موسیٰؑ کا انتظار کریں۔ صورتِ معاملہ واضح ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگی اور پہلے اپنے لیے مغفرت مانگی اس لیے کہ دعائے مغفرت میں صحیح ادب یہی ہے اور اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے

کہ حمیت حق کے جوش میں بھائی کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوگئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا ۖ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۵۲-۱۵۳)

گوسالہ پرستوں پر غضب الٰہی

یہ وہ وعید ہے جو اس موقع پر بنی اسرائیل کو سنائی گئی کہ جن لوگوں نے یہ گوسالہ سازی کی ہے ان پر آخرت سے پہلے دنیا کی زندگی میں بھی خدا کا غضب اور ذلت کی مار ہوگی، اس لیے کہ یہ اللہ پر افترا کیا گیا ہے اور اللہ پر افترا کی سزا یہی ہے۔ البتہ جو لوگ توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کر لیں گے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ غضب جس شکل میں ظاہر ہوا اس کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۵۴ کے تحت ہم پیش کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے ہر قبیلہ کے مومنین مخلصین کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے ان مجرمین کو قتل کر دیں جو فتنہ میں شریک رہے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ صرف وہ لوگ قتل سے بچے جنھوں نے توبہ کر لی۔ شرک کو اللہ پر افترا قرار دینے کی وجہ دوسری جگہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہاں توبہ کے ساتھ ایمان کی شرط مذکور ہے "ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا" اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن سے آدمی کا ایمان ہی سلب ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ گناہ انہی گناہوں میں سے تھا اس وجہ سے توبہ کے ساتھ تجدید ایمان کی شرط لگائی گئی۔ اگر گناہ کی نوعیت یہ نہ ہو تو توبہ کے ساتھ رویے کی اصلاح توبہ کو مکمل کر دیتی ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُوْنَ (۱۵۴)

'سَكَتَ' کے بعد 'عن' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'ذال' یا اس کے کسی ہم معنی لفظ کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ خاموش ہوئے اور ان کا غصہ دور ہوا۔

تورات کی ایک غلط روایت کی تردید

'اَخَذَ الْاَلْوَاحَ' انھوں نے وہ تختیاں، جو ایک طرف ڈال دی تھیں، پھر اٹھا لیں۔ اس سے ضمناً تورات کی اس غلط روایت کی تردید ہو گئی کہ تختیاں پھینکنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ یہ واضح رہے کہ ان تختیوں کو اس طرح ڈال دینے میں ان کی ناقدری کا کوئی پہلو نہیں تھا بلکہ بنی اسرائیل نے اس نعمت گراں مایہ کی جو ناقدری کی تھی اس پر اظہار غم و غصہ تھا کہ تمھارے رب نے تو تمھارے لیے یہ توقیع سیادت و امامت بھیجا اور تم ہو کہ تم نے اس طرح اپنی ناک کٹوائی۔

'وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًی وَّرَحْمَةٌ'۔ 'نُسْخَة' کسی تحریر کی حرف حرف نقل کو بھی کہتے ہیں۔ اصل تورات چونکہ انہی الواح کی نقل تھی اس وجہ سے تورات کو ان کے نسخہ سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اس میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈریں۔ یہ دوسرے لفظوں میں وہی بات ہے جو قرآن سے متعلق 'هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ہدایت و رحمت سے متعلق ہم دوسرے مقام میں عرض کر چکے ہیں کہ جب یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ آئیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔ دنیا کی زندگی میں یہ

رہنما ہوگی اور آخرت میں خدا کی رحمت کا وسیلہ۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّاىَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۡ وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۵۵-۱۵۶)

کوہِ سینا پر حاضری توبہ کے لیے تھی

یہ حضرت موسیٰؑ کے دوبارہ کوہِ سینا پر جانے کا ذکر ہے جب وہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد توبہ کے لیے گئے ہیں۔ تورات کے راویوں نے اس واقعہ کو پہلے واقعہ کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ اس وجہ سے بات گھپلا ہو کر رہ گئی ہے۔ قرآن نے ان دونوں واقعات کو الگ الگ بیان کیا ہے اس لیے کہ یہ واقعہ بجائے خود بنی اسرائیل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھنے والا واقعہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص وقت مقرر کیا اور حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب فرمائے تاکہ جس نوعیت کا اجتماعی جرم صادر ہوا ہے اسی نوعیت کی اجتماعی توبہ بھی ہو۔ نیز جو کچھ پیش آئے وہ قوم کے تمام ممتاز آدمیوں کے سامنے پیش آئے کہ وہ قوم کے سامنے اس کی گواہی دیں۔

'فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ' اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنا جلال ظاہر فرمایا تاکہ بنی اسرائیل کے لیڈروں کو پھر یاددہانی ہو جائے کہ جس خداوند کے ساتھ ان کا معاملہ ہے اس کے جلال و جبروت کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

"جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے ..... اور کوہِ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا ..... اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔" خروج باب ۱۹ - ۱۸-۱۹

اگرچہ تورات میں یہ ذکر اس موقع کا ہے جب بنی اسرائیل کو مشہور احکام عشرہ دیے گئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہی صورتِ حال اس توبہ کے موقع پر بھی پیش آئی ہے جس کا ذکر قرآن نے 'اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ' سے کیا ہے۔

'قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ' اب یہ حضرت موسیٰؑ کی گریہ وزاری اور ان کی دعا و فریاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ جلال تیرے غضب کا مظہر ہے اور تو نے ہمارے ہلاک کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے تو یہ کام تو اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی کر دیتا لیکن اب جب کہ تو نے ہمیں باریابی کا موقع عنایت فرمایا اور ہم یہاں حاضر ہو بھی گئے تو یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو ہمیں ہلاک کرے۔

'اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ' مطلب یہ کہ یہ جو کچھ ہوا جماعت کے اندر کے نادانوں کی بدبختی سے ہوا اور یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو نادانوں کے کسی مجرم کی پاداش میں سب کو ہلاک کر دے۔

'اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ الایۃ' مطلب یہ کہ یہ تو تیری ایک آزمائش تھی اور تیری آزمائش سے عہدہ برا تو وہی

ہوتے ہیں جن کو تیری توفیق حاصل ہو۔ تو ہی جن کو توفیق بخشتا ہے تیرے امتحان میں کامیاب ہوتے اور ہدایت پاتے ہیں، اور جن کو اپنی توفیق سے محروم کر دیتا ہے وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ نے اسی سنت اللہ کا حوالہ دیا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کا ذکر بار بار قرآن میں ہو چکا ہے لیکن ساتھ ہی نہایت ہی ادب کے ساتھ اور نہایت ہی لطیف طریقہ پر اس میں معاملے کی نزاکت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ تیرے امتحانوں میں پورا اترنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ یہ تیرے فضل اور تیری توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔ تو ہی ہمارا ولی اور کارساز ہے تو ہمیں بخش، ہم پر رحم فرما تو بہترین بخشنے والا ہے۔

خدا کی آزمائش سے عہدہ برآ ہونا آسان بازی نہیں ہے

'وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً الایۃ' اس دنیا میں بھی ہمارے لیے بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی بھلائی لکھ دے۔ آخرت کے ساتھ لفظ 'حَسَنَةً' کو حذف کر دیا اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل ہے۔ لفظ 'هُدْنَا' پر دوسری جگہ ہم بحث کر چکے ہیں۔ اس کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہود کے لیے ایک لطیف یاد دہانی بھی ہے کہ اگر ان میں کچھ حیا ہے تو اپنے نام کی لاج رکھیں۔

'قَالَ عَذَابِيْ أُصِيْبُ بِهٖ مَنْ أَشَآءُ الایۃ' حضرت موسیٰؑ کی دعا مطلق تھی اور قوم کے ساتھ ان کو جو محبت تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی تعمیم کے ساتھ قوم کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی دعا مانگیں۔ تورات میں بھی اس موقع کی دعا اسی تعمیم کے ساتھ مذکور ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اپنے عذاب و رحمت کا اصل ضابطہ بیان فرما دیا۔ فرمایا کہ جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں انہی پر نازل کرتا ہوں جن پر چاہتا ہوں۔ 'جن پر چاہتا ہوں' کا مطلب بار بار ہم واضح کر چکے ہیں کہ خدا کا ہر چاہنا اس کی حکمت اور اس کے عدل کے تحت ہے اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں اپنا عذاب صرف ان پر نازل کرتا ہوں جو میرے قانونِ عدل کے تحت اس کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ رہی میری رحمت تو وہ اس دنیا میں تو ہر چیز کو عام ہے جس کو بھی وجود کی نعمت ملی ہے میرے ہی فضل سے ملی ہے، جس کو بھی رزق پہنچ رہا ہے میرے ہی خوانِ کرم سے پہنچ رہا ہے، امیر و غریب، شاہ و گدا اور کافر و مومن جس کے پاس بھی جو کچھ ہے سب میرا ہی عطا کردہ ہے لیکن وہ رحمت جو آخرت سے متعلق ہے اس کو میں ان لوگوں کے لیے خاص رکھوں گا جو اس دنیا کی زندگی میں مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے اور خاص کر ان کے لیے جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

خدا کی رحمت اور نقمت کا ضابطہ

'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' کا ٹکڑا یہاں خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ 'يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا' بلکہ اسلوب بدل کر فرمایا 'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' اسلوب کی اس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہے کہ خاص کر وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو لوگ قرآن کے نظائر پر نگاہ رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے انبیا پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا اور جس کی وضاحت مائدہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

ایک توجہ طلب ٹکڑا

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ۱۲ - مائدہ ۵

اور اللہ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کا اہتمام قائم رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی تائید کرو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے۔ اگر تم یہ کرو گے تو میں تمہارے گناہ تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ پس جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا۔

یہ عہد یوں تو ان تمام نبیوں اور رسولوں پر مشتمل تھا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے لیکن اس میں خاص اشارہ اس نبی امی کی طرف تھا جس کی بعثت کی پیشین گوئی خود سیدنا موسیٰؑ نے، جیسا کہ بقرہ میں گزر چکا ہے، بڑی تصریح کے ساتھ فرمائی تھی۔ آل عمران میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۸۱ - اٰلِ عمران

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے نبیوں کے باب میں میثاق لیا کہ ہم نے تم کو کتاب اور حکمت سے نوازا، پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول تصدیق کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کی جو تمہارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس باب میں میری سونپی ہوئی ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اس پر گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

یہی عہد و میثاق ہے جس کی طرف 'وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ' کے الفاظ میں اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰؑ کی درخواست کے جواب میں یہ تصریح فرما دی کہ میری ابدی اخروی رحمت کے سزاوار صرف وہ لوگ ٹھہریں گے جو میرے عہد شریعت پر قائم رہیں گے، آگے آنے والے نبیوں اور رسولوں کی تائید کریں گے اور ان میں سے جن کو میرے آخری رسول کی بعثت نصیب ہو گی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے مددگار و خدمت گزار بنیں گے۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو قرآن نے بر سبیل تضمین و تفسیر وضاحت فرما دی کہ آج اس 'وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ' کے مصداق کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ۫ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ

وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷)

ایک ابہام کی وضاحت

یعنی وہ لوگ جو اس نبی امی کی پیروی کریں جس کی پیشین گوئیاں خود ان کی اپنی کتابوں، تورات و انجیل میں موجود ہیں۔ نبی امی سے مراد ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول، نبی، امی، یہ تینوں الفاظ یہاں آپ کی تعریف اور تعارف کے طور پر وارد ہوئے ہیں۔ نبی اور رسول کے فرق کی طرف مختلف مقامات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ رسول اپنی قوم کے لیے کامل حجت اور کامل عدالت کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے قوم پر اللہ کی حجت پوری کر دی جاتی ہے اس وجہ سے اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی تو لازماً تباہ کر دی جاتی ہے اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو لازماً مخالفین پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ نبی کی زندگی ہی میں ہو یا اس کی وفات کے بعد۔ نبی کے لیے ان خصوصیات کا حامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس پہلو سے ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے۔

بنی اسمٰعیل کے لیے 'امیین' کا لقب

لفظ 'امی' پر ہم آل عمران کی آیت ۲۰ کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہ لفظ بنی اسمٰعیل کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ بنی اسمٰعیل چونکہ تعلیم و تعلم اور کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ تھے، اس پورے دور میں جو ان کے بزرگ خاندان حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد گزرا ان کے ہاں کسی نبی یا رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی جب کہ اسی دوران میں بنی اسرائیل کے اندر بے شمار نبی پیدا ہوئے جن میں سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے۔ اس وجہ سے بنی اسرائیل بنی اسمٰعیل کو 'امیین' کہتے تھے۔ اگرچہ بنی اسرائیل اس لفظ کو بنی اسمٰعیل کے صرف ایک وصف امتیازی ہی کو پیش نظر رکھ کر نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ اپنے مقابل میں ان کی تحقیر کا پہلو بھی ان کے ذہن میں ہوتا تھا لیکن امیت و بدویت اور کتاب و شریعت سے بیگانگی چونکہ بطور ایک امر واقعہ کے ان کے اندر موجود تھی اس وجہ سے قرآن نے، جیسا کہ سورۂ جمعہ میں ہم واضح کریں گے، اس لفظ کو ان کے لیے بطور ایک امتیازی لقب کے استعمال کیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا اور صحابہؓ بھی اس کو بلا کسی احساس کہتری کے استعمال کرتے تھے گویا بنی اسرائیل کے بالمقابل ان کے لیے یہ ایک امتیازی لقب تھا۔

نبی امی کی پیشگوئیاں پچھلے صحیفوں میں

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات و انجیل کی جن پیشین گوئیوں کا حوالہ ہے ان میں سے بعض کا، جو موجودہ تورات و انجیل میں بھی موجود ہیں، ذکر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ محض بطور یاد دہانی ان کا حوالہ یہاں ہم پھر دیے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب، بنی اسمٰعیل کے اندر ایک صاحب رسالت نبی کی بعثت سے پہلے سے واقف تھے اور اس کا چرچا ان کے ہاں برابر قائم رہا ہے۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا

کرے گا، تم اس کی سُننا ..... اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ استثنا ۱۸ - ۱۵ - ۱۹

اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰؑ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسمٰعیل یعنی اتیوں میں پیدا ہوگا اس لیے کہ اس سیاق میں "تیرے بھائیوں میں سے" یا "انہی کے بھائیوں میں سے" کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی زبان مبارک سے گویا اسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی۔ تفصیلات اس کی بقرہ میں گزر چکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہوگا بلکہ رسول بھی ہوگا اس لیے کہ "میری مانند" اور "تیری مانند" سے مراد حضرت موسیٰؑ کے مانند ہے اور حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی۔" استثنا ۳۳ ب ۲

"آتشی شریعت" سے میرے نزدیک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیح نے ظاہر فرمائی ہے کہ اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھُس سے الگ کرے گا، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھُس کو جلا دے گا۔ یہ ٹھیک ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔

یسعیاہ نبی کی پیشینگوئی ان الفاظ میں مذکور ہے۔

"دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا، بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا، اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ ملا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا۔" یسعیاہ ۴۲ ب ۱ - ۴

سیدنا مسیح کی پیشینگوئی ملاحظہ ہو۔

یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لیے میں

تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی ب ۲۱ ۴۲-۴۴

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔" یوحنا ب ۱۴ - ۱۷

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" یوحنا ب ۱۴ ۳۱

ان پیشینگوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشینگوئیوں کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اس پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے لیکن جو شخص بھی ان پیشینگوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آ سکتی ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی راست آ سکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلعم کا تعارف

'یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ الآیۃ'۔ ان باتوں کا حوالہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور تعارف ہی کے طور پر دیا گیا ہے۔ یہود نے اپنے اوپر بہت سی خود ساختہ پابندیاں بھی لاد رکھی تھیں اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر عاید کر دی گئی تھیں۔ ان ساری چیزوں کے دور ہونے کا انحصار آخری رسول کی بعثت پر تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے ان کی یہ ساری زنجیریں کاٹ دیں لیکن انھوں نے اپنی شامتِ اعمال کے سبب سے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ اس مسئلہ پر آل عمران آیت ۹۳ - مائدہ آیت ۵ کے تحت بھی ہم لکھ چکے ہیں اور سورہ انعام کی تفسیر میں بھی اس پر وضاحت سے بحث ہوئی ہے اس وجہ سے یہاں اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اہل کتاب کی نجات کا انحصار نبی امی پر ایمان لانے

'فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ الآیۃ' یہ اہل کتاب کو دعوت ایمان ہے کہ جو لوگ اس رسول کے باب میں سابق پیشینگوئیوں کے امین ہیں اور جن کو اس کی بعثت سے یہ سعادت حاصل ہونے والی ہے کہ تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے سب سے پہلے انہی کا حق ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں، لوگوں میں اس کا تعارف کرائیں، مخالفوں کے مقابل میں اس کی حمایت کریں اور اس روشنی یعنی قرآن کی پیروی کریں جو اللہ

کی طرف سے دے کر وہ بھیجا گیا۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پانے والے بنیں گے باقی سب محروم و نامراد ہوں گے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۵۸)

آنحضرتؐ کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی

جب بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک پہنچ گئی تو برسرِ موقع آپ کی زبان مبارک سے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت بھی دلوا دی گئی کہ اے لوگو، میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ "سب لوگوں کی طرف" یعنی بنی اسمٰعیل و بنی اسرائیل، عرب اور غیر عرب سب کی طرف۔ اوپر کی پیشینگوئیوں میں بھی تصریح ہے کہ اگرچہ آپ کی بعثت بنی اسمٰعیل میں ہوگی لیکن آپ کی رسالت سب کی طرف ہوگی اور دنیا کی سب قومیں آپ کی برکات میں سے حصہ پائیں گی۔ اہل عرب پر، عام اس سے کہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل، آپ نے اللہ کی حجت براہ راست قائم کی اور وقت کے ملوک و سلاطین کو بھی آپ نے دعوت دی اور آپ کے بعد اس دعوت و شہادت کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر ڈالی جس کو 'شُھَدَاءَ اللہ فی الارض' کے منصب عالی پر سرفراز فرمایا۔

'اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے جس کا میں رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اسی کے اختیار میں قوموں کا عزل و نصب ہے تو کسی بے جا عصبیت، کسی غلط اعتماد اور کسی بے بنیاد غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اللہ اور اس کے نبی امی رسولؐ پر جس کی پیشینگوئیاں تمھاری اپنی کتابوں میں موجود ہیں ایمان لانے سے گریز نہ اختیار کرو۔

'اَلَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے جو اوپر حضرت موسیٰؑ کی پیشینگوئی میں مذکور ہوئی ہے کہ میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہ وہی لوگوں سے کہے گا، مطلب یہ ہوا کہ نبی کے اس دعوائے نبوت اور اس کی اس دعوت کو کسی وہم، کسی خیال اور دوسروں پر برتری اور سیادت حاصل کرنے کی کسی خواہش پر مبنی نہ سمجھو۔ یہ تو وہی کچھ تمھیں سنایا جا رہا ہے جو اللہ کی طرف سے آ رہا ہے۔ پیغمبر خود اللہ پر اور اس کی ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اسی ایمان کی دعوت تمھیں دے رہا ہے۔ یہ اس کی اپنی کوئی ایجاد نہیں ہے۔ دوسرے اس میں وہ دھمکی بھی مضمر ہے جو اوپر والی پیشینگوئی میں مذکور ہے کہ چونکہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے اس میں پیغمبر کی طرف سے کسی کمی بیشی، کسی حذف و اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر پیغمبر نے اس کی تبلیغ میں کوئی مداہنت برتی تو خدا اس سے اس کا مواخذہ فرمائے گا اور اگر لوگوں نے اس سارے اہتمام کے باوجود اس کا حق نہ پہچانا تو ان سے مواخذہ ہوگا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۵۹)

صالحین اہل کتاب کی حوصلہ افزائی

ہم پیچھے ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں اور بداعمالیوں پر شدت کے ساتھ سرزنش کی ہے وہاں ان کے اندر کے اس گروہ قلیل کی تحسین بھی فرمائی ہے جو حق و عدل پر قائم رہا ہے اور جس کی بدولت بنی اسرائیل کو ان کے جرائم کے باوجود مہلت ملتی رہی ہے۔ یہاں بھی اسی گروہ کی طرف اشارہ ہے اور لفظ 'اُمَّةٌ' کی تنکیر اس کی قلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ 'يَهْدُوْنَ' اور 'يَعْدِلُوْنَ' مضارع کے صیغے استمرار کو ظاہر کر رہے ہیں اس لیے کہ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ جہاں موسیٰ کی قوم میں اس طرح کے ناب کار و ناہنجار پیدا ہوتے ہیں، جن کا ذکر اوپر گزرا، وہیں ان کے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی برابر رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور عدل کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ یعنی علما اور قضاۃ دونوں ہی گروہوں میں اچھے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح کا ایک گروہ، قلیل تعداد میں سہی، ان آیات کے نزول کے زمانے میں بھی موجود تھا اور یہی لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ ان کے یہاں ذکر سے مقصود ان کی حوصلہ افزائی ہے اور اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ پیغمبرؐ نے یہ اہل کتاب کو جو دعوت دی ہے وہ اس طرح کے صالحین پر اثر انداز ہو گی اور وہ نبی امی پر ایمان لے آئیں گے۔

اس آیت پر وہ تضمین یا تخلیص جو 'الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ' سے شروع ہوئی تھی ختم ہوئی اور آگے سلسلۂ کلام پھر بنی اسرائیل کی اسی سرگزشت سے جڑ گیا جو بیان ہو رہی تھی۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۱۶۰-۱۶۲)

ناشکری کے باوجود بنی اسرائیل پر احسان

معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یہ آیتیں بقرہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ وہاں پوری تفصیل سے ان کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ۵۷، ۶۰ بقرہ۔ لفظ 'اَسْبَاط' پر بھی بقرہ کی آیت ۱۳۶ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔ لفظ 'تقطیع' یہاں اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایک ہی باپ کی اولاد بارہ خاندانوں کی شکل میں پھلی پھولی، اور ہم نے ہر خاندان کو امتوں اور قوموں کی شکل میں بڑھایا اور پھیلایا اور اسی اعتبار سے ان کو اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے بھی نوازا لیکن انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی۔

وَسْــَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ

يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝
وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا
مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ
وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَـِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ
كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (۱۶۳-۱۶۶)

'وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الاية' جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کا ذکر بقرہ آیات ۶۵-۶۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان چیزوں پر روشنی ڈالیں گے جو وہاں بیان نہیں ہوئی ہیں۔

بنی اسرائیل کو ان کی پچھلی کارستانیوں کی یاد دہانی

'وَسْـَٔلْهُمْ' کا اسلوب زجر و توبیخ کو ظاہر کر رہا ہے۔ 'ھُمْ' سے مراد یہود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی ان تمام کرتوتوں کے باوجود جو بیان ہوئیں اپنی پاکی و برتری کے زعم سے باز نہیں آتے اور اپنے آپ کو خدا کا چہیتا اور لاڈلا بنائے بیٹھے ہیں تو ذرا ان سے اس قریہ کا ماجرا پوچھو جس نے سبت کی بے حرمتی کی اور اس کی سزا میں خدا نے اس کو نمونۂ عبرت بنا دیا۔ قرآن نے اس قریہ کی اس سے زیادہ تصریح نہیں فرمائی کہ یہ سمندر کے کنارے تھا۔ تورات میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قرآن کا انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ زمانۂ نزول قرآن کے یہود اپنی تاریخ کی ایک مشہور روایت کی حیثیت سے اس کو جانتے تھے۔ چنانچہ بقرہ میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے 'وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ' (اور ان کو تو تم جانتے ہی ہو جنھوں نے تم میں سے سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی سے تجاوز کیا) ظاہر ہے کہ یہود کے رو در رو اس اسلوب میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ان کے درمیان شہرت رکھتی ہو ورنہ وہ قرآن کے اس بیان کی ضرور تردید کرتے۔ بعض لوگوں نے اس کو ایلہ اور عقبہ کے پاس کا کوئی شہر بتایا ہے۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ سمندروں کے کنارے کے شہر، اگر جائے وقوع مناسب ہو تو تجارتی مرکز بن جاتے ہیں اور بہت ترقی کر جاتے ہیں۔ عقبہ کے علاقے کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں قدیم زمانے سے شہرہ حاصل ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے بحری بیڑے کا مرکز بھی یہی تھا۔ لفظ 'قریہ' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ صرف چھوٹی بستیوں ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ اس کا اطلاق بڑی بڑی مرکزی آبادیوں پر بھی ہوتا ہے۔

لفظ 'شُرَّع' کی تحقیق اور مچھلیوں کے ابھرنے کی نوعیت اور حکمت

'اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا'، 'شُرَّع'، 'شَارِعَة' کی جمع ہے۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اس سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے ان کے ابھرنے کے اوقات میں، کھڑے ہو جائیے تو یہ دلکش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح پر اس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوئے ہیں۔ سمندروں کے کنارے جو شکار گاہیں ہوتی ہیں ان میں یہ منظر اور

بھی دلفریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ یہود کی شریعت میں سبت یعنی ہفتہ کے دن کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ اُنھوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کر لیے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کے حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تو اس معاملے میں اس کی آزمائش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ ان کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز ان کی حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جائے اس کی خواہش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خواہش وہ بلا ہے کہ اس کے اثر سے بسا اوقات آدمی کی نگاہ بھی بدل جاتی ہے۔ خواہش نہ ہونے کی صورت میں جو چیز چھٹانک بھر نظر آتی ہے، خواہش کے غلبہ کی حالت میں وہی سیر بھر نظر آنے لگتی ہے۔ مشہور ہے کہ حُسن کا اندازہ کرنے میں حسن سے زیادہ حسنِ نظر کو دخل ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل اپنی شامتِ اعمال سے اس دہرے فتنے میں مبتلا ہو گئے اور پھر اس حد تک خراب ہوئے کہ نیکوں کی تلقین و موعظت تو درکنار خدا کے عذاب سے بھی ان کو تنبیہ نہیں ہوئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی۔

بنی اسرائیل اور امتِ مسلمہ کے امتحان میں مشابہت

سورۂ مائدہ آیت ۹۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جس طرح بنی اسرائیل کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی اسی طرح ہمارے لیے حالتِ احرام میں خشکی کے شکار کی ممانعت ہوئی اور ہم کو بھی اس طرح کی آزمائش سے بچتے رہنے کی تاکید کی گئی جس میں بنی اسرائیل مبتلا ہو کر اپنے کو تباہ کر بیٹھے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۹۴ مائدہ) (اے ایمان والو، اللہ تمھیں کسی ایسے شکار سے آزمائے گا کہ تم خیال کرو گے کہ تمھارے ہاتھ اور نیزے ان کو پا لیں گے تاکہ اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے جو اس سے غیب میں ڈرتے ہیں تو جو اس کے بعد حدود سے تجاوز کریں گے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔) تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا اور تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ کے الفاظ پر ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر غور کیجیے تو دونوں کی مشابہت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

حقِ نصیحت آخری دم تک

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے شقاوت کی یہ راہ سمجھانے بجھانے والوں کے علی الرغم اختیار کی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کو کوئی آگاہ کرنے والا نہیں تھا، اللہ کے ایسے بندے وہاں تھے جنھوں نے ان کو نہ صرف اس جرم سے روکنے کی کوشش کی بلکہ اس حد تک کوشش کی کہ ان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے اب مزید سمجھانے کو بالکل غیر مفید سمجھا اور یہ کہا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل جو اب یا تو ہلاک ہونے والے ہیں یا کم از کم یہ کہ کسی شدید عذاب کی پکڑ میں آنے والے ہیں۔ لیکن اللہ کے ان بندوں نے اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو یہ جواب دیا کہ ہمارا سمجھانے

کا کام جاری رہنا چاہیے، اگر یہ لوگ نہ مانے تو ہم اللہ کے ہاں اپنے فرض سے سبکدوش ٹھہریں گے اور کیا عجب کہ مان ہی جائیں، سو اگر مان گئے تو یہی مطلوب ہے۔

نہی عن المنکر کے بارے میں ذمہ داری کی حد

اس سے اس ذمہ داری کی حد معین ہوتی ہے جو ہر مومن پر دوسروں کو برائی سے روکنے اور بھلائی کی دعوت دینے کی عاید ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا جب داعی اور ناصح یہ فرض کر لیں کہ اب دعوت و نصیحت کا فرض ادا ہو گیا اس لیے نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے بلکہ یہ کام زندگی کے آخری لمحے تک کرتے رہنا چاہیے اگرچہ ایک شخص بھی نصیحت کا قدر کرنے والا نہ نکلے۔ عند اللہ ایسے ہی لوگ اپنے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے۔ وہ لوگ اللہ کے ہاں بری نہیں ہوں گے جو خود اگرچہ برائی میں مبتلا نہ ہوں لیکن دوسروں کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں۔ اس مضمون پر مفصل بحث انفال آیت ۲۵ کے تحت آئے گی۔

عذاب کی پکڑ سے صرف حق نصیحت ادا کرنے والے بچتے ہیں

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ یعنی جب وہ تنبیہات جو انھیں کی گئی تھیں وہ بھلا بیٹھے اور کسی طرح سوچنے سمجھنے پر راضی نہ ہوئے تو اللہ نے ان کی اس نافرمانی و عہد شکنی کی پاداش میں ان پر ایک سخت عذاب بھیجا جس سے صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو لوگوں کو برائی سے روکنے والے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی اجتماعی نافرمانیوں پر جب اللہ کا کوئی فیصلہ کن عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی پکڑ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو برائی سے روکنے والے ہوتے ہیں۔

لعنت بدترین عذاب ہے

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ الآیۃ یہ اس لعنت کا ذکر ہے جو ان نافرمانوں پر ہوئی اور جس کا ذکر بقرہ ۶۵ اور مائدہ ۶۱ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔ کسی قوم پر اللہ کی لعنت اس عذاب سے بھی سخت تر چیز ہے جو کسی قوم کو فنا کر دیتا ہے اس لیے کہ لعنت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم بظاہر زندہ رہتی ہے لیکن اس کی زندگی صرف ذلت و خواری کی ایک داستانِ عبرت ہوتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اس بستی پر اللہ کی ایسی لعنت ہوئی کہ وہ دیکھنے والوں کے لیے ایک نمونۂ عبرت بن کر رہ گئی۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۶۷)

یہود ابد تک لعنت ہے

'تاذن' کا صحیح مفہوم کسی فیصلۂ قطعی سے لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کی اس طرح کی بدعہدیوں کی بنا پر ان کو ان کے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر ایسے لوگوں کو قیامت تک مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت سخت عذابوں میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ اس طرح کی تنبیہ ان کو حضرت موسیٰؑ نے بار بار فرمائی اور بعد کے نبیوں نے بھی نہایت آشکارا الفاظ میں اس سے آگاہ کیا۔ احبار میں ہے۔ "اگر تم میرے سننے والے نہ بنو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو..... اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا..... اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہوگا اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کیے جاؤ گے اور

جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے " احبار باب ۲۶، ۱۴-۱۷۔ اسی طرح کتاب استثنا میں ہے "تیرے بیٹے اور عزیز بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا۔ استثنا باب ۲۸-۳۲۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی عملی تصدیق تاریخ کے صفحات میں مرقوم ہے۔ اس کے لیے بخت نصر اور ٹیٹس سے لے کر جرمنی کے ہٹلر تک کی تاریخ پڑھ جائیے، ہر دور میں آپ کو اس قوم کی ذلت و بربادی کی نہایت لرزہ خیز داستان مل جائے گی۔ یہ ملحوظ رہے کہ بیچ بیچ میں مہلت کا کوئی وقفہ مل جانے سے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی نفی نہیں ہوتی ہے۔ قرآن کا اسلوب بیان خود شاہد ہے کہ ان کو وقفے بھی ملتے رہیں گے لیکن ہر وقفہ ان کے لیے کسی تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ آج ارض مقدس میں ان کا جو اجتماع ہو رہا ہے یہ آشیاں بندی بھی ایک نئے طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد ان کی پوری مجتمع قوت انشاء اللہ یک قلم ختم ہو جائے گی۔ یہاں اشارہ پر کفایت کیجیے۔ اس کی وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں آئے گی۔

'اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ' میں اس فیصلہ الٰہی کی حقیقت صفات الٰہی کے آئینہ میں دکھائی گئی ہے کہ کوئی خدا کو اس دنیا کے معاملات سے بے تعلق یا الگ تھلگ نہ خیال کرے۔ جو لوگ اس کی راہ سے بے راہ ہوتے ہیں ان کو وہ سزا بھی بڑی ہی سخت دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لیے وہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ 'عقاب' کے ساتھ 'سریع' کی صفت ان لوگوں کی بلادت پر ضرب لگانے کے لیے ہے جو خدا کی دیر کو اندھیر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی اس کی بخشی ہوئی مہلت سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ جب پکڑتا ہے تو آناً فاناً پکڑتا ہے اور جن کو پکڑتا ہے وہ بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ صبح کی شام بھی نہیں ہونے پائی کہ دھر لیے گئے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۱۶۸)

بنی اسرائیل کا انتشار

'وَقَطَّعْنٰهُمْ' اوپر آیت ۱۶۰ میں بھی گزر چکا ہے، وہاں جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا اچھے مفہوم میں ہے۔ یہاں یہ لفظ اس کے برعکس ان کی پراگندگی اور انتشار کے دور کے حالات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی جو تنظیم کی وہ اپنے پورے شباب پر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں پہنچی۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد اس تنظیم میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا اور پھر بتدریج حالات ایسے خراب ہوتے گئے کہ یہود اپنے مرکز میں بھی محکوم ہو گئے۔ یہاں تک کہ گروہ گروہ ہو کر دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ اگرچہ انفرادی حیثیت سے ان میں نیک بھی تھے اور بد بھی لیکن اجتماعی حیثیت سے وہ ان اوصاف سے محروم ہو چکے تھے جو ایک ملت کی حیثیت سے ان کو دنیا میں سربلند رکھنے کے لیے ضروری تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو اچھے اور برے ہر طرح کے حالات سے آزمایا تاکہ وہ اپنے رب کی

طرف رجوع کریں لیکن ان کی خواہشیں اس طرح ان پر غالب آگئی تھیں کہ ان کے آگے ان کی قوت ارادی بالکل مفلوج ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ یہ احساس رکھتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے وہی کام کیے جاتے اور اپنے ضمیر کو یہ دھوکا دیتے کہ ہم خدا کے چہیتوں اور محبوبوں کی اولاد ہیں، خدا ہمیں معاف ہی کر دے گا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶۹)

روزافزوں زوال

عربی میں جب لفظ 'خَلْف' سکون لام کے ساتھ آتا ہے تو بُرے جانشینوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہ یہود کے تدریجی زوال کی طرف اشارہ ہے کہ دن پر دن ان کے اخلاقی حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے یہاں تک کہ ایسے بُرے لوگ کتاب (تورات) کے وارث ہوئے جو ایک طرف کتاب الٰہی کے وارث ہونے کے مدعی ہیں دوسری طرف پست ہمتی اور دناءت کا یہ عالم ہے کہ جو لقمۂ حرام بھی ملتا نظر آئے اس کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ کتابِ الٰہی کے نام لیوا ہونے کے سبب سے اگر ضمیر میں کوئی خلش پیدا ہوتی بھی ہے تو ان جھوٹی آرزوؤں سے اس کو بہلا لیتے ہیں جو انھوں نے بالکل بے دلیل و سند اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں کہ ہم برگزیدہ امت ہیں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب جیسے نبیوں کی اولاد ہیں، دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے، اپنے محبوب بندوں کے صدقے میں اللہ ہمیں معاف ہی کر دے گا۔ اس طرح انھوں نے اپنے ضمیر اور ایمان کو اس طرح کُند بنا دیا ہے کہ ایک حرام کے بعد اگر اسی طرح کی حرام خوری کا کوئی اور موقع نکل آئے تو اس پر بھی پھسل پڑتے ہیں۔ ان کی اسی دناءت کی وجہ سے آگے چل کر ان کی مثال کتے سے دی ہے جو ہر وقت اپنی زبان نکالے رکھتا ہے خواہ اسے چمکار لیے یا جھڑکیے۔

سارا پڑھا لکھا برباد

'اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ الایہ' یعنی کتاب کے باب میں تو، جیسا کہ آیت ۱۴۵ میں گزرا اور تورات میں بھی بار بار ذکر ہوا ہے، ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جو ہدایات اس کتاب میں دی جا رہی ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑیں، بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہوں، کوئی بات حق کے خلاف خدا پر نہ لگائیں، تو پھر انھوں نے حرام خوری اور حرام کاری کی یہ راہ کس طرح کھول لی اور اس کے حق میں شریعت کی سند کہاں سے فراہم کر دی؟ 'وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ' یعنی انھوں نے اچھی طرح اس کتاب کو پڑھا بھی ہے، یہ نہیں کہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ 'درس' کے لفظ پر ہم انعام آیت ۱۰۵ کے تحت بحث کر آئے ہیں کہ اس کے اصل معنی گھسنے کے ہیں جب کتاب بار بار پڑھی جائے، اور وہ بھی انگلی رکھ کے تو ورق گھس جایا کرتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی اچھی طرح پڑھنے کے آنے لگے۔ یہاں یہ لفظ یہود کے لیے بطور تعریض استعمال ہوا ہے کہ کتاب کو تو پڑھتے پڑھتے انھوں نے گھس ڈالا لیکن حال وہی رہا کہ ساری زُلیخا پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ زلیخا زن بود کہ مرد۔ 'وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ' یعنی یہ سگانِ دنیا جو کتاب و شریعت سب کو بالائے طاق رکھ کے

اس طرح دنیا کے پیچھے پڑ گئے، انھیں آخرت کی نعمتوں اور کامرانیوں کا کوئی اندازہ نہیں، حالانکہ چاہنے کی اصل چیز وہی ہے لیکن ان بے وقوف لوگوں میں وہ عقل کہاں؟

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (۱۷۰)

مصلحین اہل کتاب کی حوصلہ افزائی

'تَمَسُّک' اور 'تَمَسُّک' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا یا تھامنا۔ آیت کا مطلب اوپر کی آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ بدقسمت لوگ تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چل کھڑے ہوئے حالانکہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں وہ لوگ خلق کی اصلاح کرنے والے بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اقامت نماز، یہاں تمسک بالکتاب کی علامت کی حیثیت سے بھی مذکور ہے اور یہ چیز درحقیقت ہر عہد الٰہی کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں، محافظ بھی ہے۔ آیت میں بقاعدۂ ایجاز ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے 'اور جو کتاب کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور جنھوں نے نماز کا اہتمام کیا وہی لوگ اصلاح کرنے والے ہیں اور بے شک ہم اصلاح کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے'۔ میرے نزدیک اس آیت میں اہل کتاب کے اس قلیل التعداد گروہ کی حوصلہ افزائی بھی ہے جو قوم کے عام بگاڑ کے باوجود حق پر قائم رہا اور جو بالآخر مشرف باسلام ہوا۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۱)

اس آیت کی تفسیر بقرہ آیت ۶۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ اس میثاق کی طرف اشارہ ہے جو یہود سے دامن کوہ میں کتاب پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لیے لیا گیا تھا اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال و جبروت کا بھی ان کو مشاہدہ کرایا تھا تاکہ وہ یاد رکھیں کہ جس خدا سے وہ عہد کر رہے ہیں وہ بے پناہ قوت و قدرت والا ہے لیکن انھوں نے اپنی خواہشات کے پیچھے ہر چیز کو بھلا دیا۔

۱۶۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۷۲-۲۰۶

آگے کا مضمون خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم تمہید میں عرض کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں مخاطب اصلاً قریش ہیں۔ ان کو پہلے خود ان کے اپنے ملک کی ان قوموں کے حالات سنائے گئے جو ماضی میں گزر چکی تھیں پھر بنی اسرائیل کی بھی پوری تاریخ تفصیل سے سنا دی گئی جو سامنے موجود تھے۔ مقصود ان قوموں کی تاریخ سنانے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اپنی اس دنیا کے احوال و معاملات سے بے تعلق اور کنارہ کش نہیں ہے۔ وہ خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے ہمیشہ اپنے رسول بھیجتا رہا ہے اور وہ رسول جب بھی آئے ہیں عزل و نصب کی میزان بن کر آئے ہیں۔ جن قوموں نے ان کی تکذیب

آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۷۲-۲۰۶ معانقہ

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ
اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا
بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ
مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا
لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ
ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ
لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلًا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ
الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَقَدْ
ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۡ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا
يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا
يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ

يُلْحِدُونَ فِىٓ أَسْمَآئِهِۦ ۚ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٨٠﴾ وَمِمَّنْ
ع ٢٢ ١٢ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِۦ يَعْدِلُونَ ﴿١٨١﴾ وَالَّذِينَ
كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٨٢﴾
وَأُمْلِى لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِى مَتِينٌ ﴿١٨٣﴾ أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا ۗ مَا بِصَاحِبِهِم
مِّن جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿١٨٤﴾ أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِى مَلَكُوتِ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِن شَىْءٍ ۙ وَأَنْ عَسٰىٓ أَن
يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ ۖ فَبِأَىِّ حَدِيثٍۭ بَعْدَهُۥ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٥﴾
مَن يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهُۥ ۚ وَيَذَرُهُمْ فِى طُغْيٰنِهِمْ
يَعْمَهُونَ ﴿١٨٦﴾ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۖ قُلْ
وقف منزل وقف لازم إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّى ۖ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَآ إِلَّا هُوَ ۚ ثَقُلَتْ فِى
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ يَسْـَٔلُونَكَ كَأَنَّكَ
حَفِىٌّ عَنْهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَعْلَمُونَ ﴿١٨٧﴾ قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِى نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ
معانقه اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛ وَمَا
ع ٢٣ ١٣ مَسَّنِىَ السُّوٓءُ ۛ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٨﴾
هُوَ الَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا
لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِۦ ۚ فَلَمَّآ
أَثْقَلَت دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صٰلِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ

الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٨٩﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ
فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٩٠﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا
وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَآءٌ
عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿١٩٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ ۚ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٩٤﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ
يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ
يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿١٩٥﴾
اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۡ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٩٦﴾ وَ
الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٧﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٩٨﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ
وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا
مَسَّهُمْ طٰۗىِٕفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿٢٠١﴾
وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾ وَاِذَا لَمْ
تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى

إِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ
يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ ع السجدة

ع ۲۴ ۱۸ ۱۴

ترجمہ آیات ۱۷۲-۲۰۶

اور یاد کرو، جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے — ان کی پیٹھوں سے — ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔ یا عذر کرو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا اور ہم ان کے بعد ان کے خلف ہوئے تو کیا باطل پرستوں کے عمل کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کرے گا؟ اور ہم اسی طرح اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۱۷۲-۱۷۴

اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے اگر تم اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

تو ان کو سرگزشت سناؤ تاکہ وہ غور کریں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتی رہی۔ جسے اللہ ہدایت بخشے وہی ہدایت پانے والا بنتا ہے اور جنھیں وہ گمراہ کردے وہی ہیں جو نامراد ہوتے ہیں۔ (۱۷۵-۱۷۸)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دِل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سُنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں اور اللہ کے لیے تو صرف اچھی ہی صفتیں ہیں تو انہی سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کی صفات کے باب میں کجروی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے۔ اور جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور اس کے مطابق فیصلے کرتے رہے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہم ان کو وہاں سے داؤں پر لے جا رہے ہیں جہاں سے انھیں علم نہیں اور میں انھیں ڈھیل دیے جا رہا ہوں کیونکہ میری تدبیر بہت ہی محکم ہے۔ ۱۷۹-۱۸۳

کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے وہ تو بس ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا ہے۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور ان چیزوں پر نگاہ نہیں کی جو خدا نے پیدا کی ہیں اور اس بات پر کہ کیا عجب کہ ان کی مدت قریب آ لگی ہو تو اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے ان کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان کو وہ ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا

چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں، وہ تم پر بس اچانک ہی آدھمکے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا تم اس کی تحقیق کیے بیٹھے ہو۔ کہہ دو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ کہہ دو، میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔ ۱۸۴ - ۱۸۸

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا کہ وہ اس سے تسکین پائے تو جب وہ اس کو چھا لیتا ہے تو وہ اٹھا لیتی ہے ایک ہلکا سا حمل، پھر وہ اس کو لیے کچھ وقت گزارتی ہے تو جب بوجھل ہوتی ہے دونوں اللہ، اپنے رب سے دعا کرتے ہیں، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی ہم تیرے شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔ تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ اس کے لیے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں۔ اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتی ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتی ہیں۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو وہ تمھارے ساتھ نہ لگیں گے، یکساں ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو یہ تو تمھارے ہی جیسے بندے

ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو، وہ تمھیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، کیا ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟ کہہ دو، تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، میرے خلاف چالیں چل دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ نیکوکاروں کی کارسازی فرماتا ہے اور جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو نہ وہ تمھاری ہی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو وہ تمھاری بات نہ سنیں گے اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمھاری طرف تاک رہے ہیں لیکن انہیں سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تمھیں کوئی وسوسۂ شیطانی لاحق ہونے لگے تو اللہ کی پناہ چاہو، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتہً ان کے دِل روشن ہو جاتے ہیں۔ اور جو ان ناخدا ترسوں کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں پھر کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ۱۸۹-۲۰۲

اور جب تم ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے کہتے ہیں کہ اسے کیوں نہ گھڑ لائے! کہہ دو، میں تو بس اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے والی آیات اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ اور جب قرآن سُنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۲۰۳-۲۰۴

اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور پست آواز سے اور غافلوں میں سے نہ ہو۔ بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے نہیں اکڑتے، وہ اس کی تسبیح کرتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ ۲۰۵-۲۰۶

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۷۲-۱۷۴)

'اِذْ' اور واحد کے خطاب کے مواقع استعمال

'وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'اذ' کے ذریعہ سے کسی ایسے امر واقعی کی یاد دہانی بھی کی جاتی ہے جو متکلم کے نزدیک ایک حقیقت ہو، قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کو فراموش کیے ہوئے ہوں یا اس سے منحرف ہوں۔ اسی طرح واحد کے خطاب کے متعلق بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرینہ دلیل ہو تو یہ جمع کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے اور اس صورت میں گویا مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔

'مِنْ ظُهُوْرِهِمْ' کی قید کا فائدہ

'مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ' میں 'مِنْ ظُهُوْرِهِمْ' 'مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ' سے بدل واقع ہے اور اس بدل کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بنی آدم سے متعلق یہاں جو حقیقت بیان ہو رہی ہے وہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ قیام قیامت تک جتنے بھی بنی آدم پیدا ہونے والے ہیں سب ہی سے متعلق ہے۔

تمام بنی آدم سے خدا نے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا

'وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور وہ اس طرح کہ اس نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، اس کے جواب میں سب نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ یہ اقرار اللہ تعالیٰ نے صرف اس بات کا نہیں لیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا لیا کہ وہی رب بھی ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ اہل عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا لیے تھے حالانکہ عہد فطرت میں اقرار صرف اللہ ہی کی ربوبیت کا ہے۔

توحید بدیہیات فطرت میں سے ہے

اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ، 'اَنْ' سے پہلے 'کراھۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مبادا تم قیامت کے دن عذر کرو، اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک توحید اور بدیہیاتِ فطرت کا تعلق ہے ان کے باب میں قیامت کے دن مواخذہ ہر شخص سے مجرد اس اقرار کی بنا پر ہوگا جو مذکور ہوا، قطع نظر اس سے کہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی یا نہیں۔ اگر کسی نبی کی دعوت اس کو پہنچی ہے تو یہ گویا ایک مزید حجت اس پر قائم ہوگئی کہ اس کی مسئولیت دوچند ہوگئی لیکن نبی کی دعوت اگر نہیں پہنچی تو یہ بدیہیات فطرت کے معاملے میں کوئی عذر نہیں بن سکے گی۔ ان پر مواخذہ کے لیے فطرت کا یہ عہد کافی ہے۔

'اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا الایۃ' اسی طرح لوگوں کا یہ عذر بھی کچھ کام نہ آئے گا کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے، ہم انہی کے ہاں پیدا ہوئے اور پھر قدرتی طور پر ہم نے انہی کے طریقے کی پیروی کی اس وجہ سے یہ جرم ہمارا نہیں بلکہ ان کا ہے، اس کی سزا ان کو ملنی چاہیے نہ کہ ہم کو۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ اقرار توحید انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے اس وجہ سے اس باطنی شہادت سے انحراف کے لیے خارجی اثرات کا عذر بھی کسی کا خدا کے ہاں مسموع نہیں ہوگا۔

'وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ الایۃ' اس آیت میں قرینہ دلیل ہے کہ 'لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر اس کو کھول دیا جائے تو ہمارے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل اس لیے کر رہے ہیں تاکہ ہم لوگوں پر اپنی حجت اس طرح قائم کر دیں کہ ان کے لیے کوئی ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہ جائے اور تاکہ اس وضاحت کے بعد ان میں سے جو شرک سے تائب ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیں وہ رجوع کر لیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے مذکورہ عہد لینے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ اس نے اس عہد و میثاق کی پوری تفصیل بھی سنا دی تاکہ جو اپنی غلطی سے توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کر لیں اور جو اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہیں وہ اس کے نتائج کا ذمہ دار اپنے ہی کو سمجھیں، کسی اور کی گردن پر اس کا بار الزام ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔

عہد فطرت سے متعلق بعض سوال اور ان کے جواب

اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کیا ہے اور اس کی اہمیت یہ بتائی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے ہر شخص مجرد اسی عہد کی بنا پر عنداللہ مسئول ہوگا۔ اس کی اس اہمیت کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عالم غیب کے کسی ایسے ماجرے کی یادداشت انسان کے ذہن میں محفوظ ہے جس کا یہاں ذکر ہوا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ کس طرح باور کیا جائے کہ فی الواقع انسان نے اس طرح کا کوئی اقرار کیا ہے اور اس کی بنیاد پر وہ توحید کے معاملے میں عنداللہ مسئول ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اس اقرار کا تعلق ہے وہ تو ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے، رہا اس کا موقع و محل اور اس کی تاریخ تو وہ اگر یاد نہیں رہی تو اس سے نفس اقرار کی صحت و صداقت

پر کوئی اثر نہیں پڑتا، زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اقرار تو مجھے یاد ہے البتہ اس کا موقع و محل یاد نہیں ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس کا موقع و محل بتا دیا کہ یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم غیب میں خدا نے اس سے لیا ہے اور یہ بات خدا ہی بتا سکتا تھا اس لیے کہ غیب کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔ انسان پر حجت قائم ہونے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس اقرار کی یادداشت اس کے اندر موجود ہے۔

دین کا نقطۂ آغاز

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کے اندر ابتدا ہی سے یہ اقرار موجود ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان وجود میں آنے کے بعد دین کا آغاز خالص خدا پرستی اور توحید سے کرتا لیکن ہمارے نئے فلسفی تو یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا ہے۔ دنیا میں گوناگون حوادث کے ظہور نے اس کے اندر مختلف ان دیکھی طاقتوں کا خوف پیدا کیا، اس خوف نے اس کے اندر ان ان دیکھی طاقتوں کی پرستش کا خیال پیدا کیا، چنانچہ اس نے ان کی پرستش شروع کی، پھر آہستہ آہستہ اس کے علم میں جتنی ترقی ہوتی گئی ان وہمی معبودوں سے چھوٹ کر وہ اقرار توحید کی منزل تک پہنچا۔ ہم نے نئے فلسفیوں کے اس واہمہ کی تردید سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بھی کی ہے اور اس سے زیادہ تفصیل اپنی کتاب حقیقت شرک میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تقریر بالکل غیر منطقی ہے۔ ہم نے مذکورہ کتابوں میں واضح کیا ہے کہ خوف نام ہے کسی ایسی چیز کے زائل ہونے یا چھن جانے کے اندیشہ کا جو انسان کو حاصل بھی ہو اور جو عزیز و محبوب بھی ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعمت، منعم، اور اس کی شکر گزاری کا شعور اور جذبہ، خوف کے جذبہ اور اس کے عوامل پر مقدم ہے اس وجہ سے انسان نے خوف سے دین کا آغاز نہیں کیا بلکہ اپنے منعم پروردگار کی شکر گزاری اور اس کی عبادت سے دین کا آغاز کیا لیکن پھر مختلف اسباب کے تحت، جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب حقیقتِ شرک میں کی ہے، وہ اس جادۂ مستقیم سے ہٹ کر مختلف پگڈنڈیوں پر نکل نکل گیا ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی فطرت بالکل ایک لوح سادہ ہوتی ہے، اس پر جتنے نقوش بھی ابھرتے ہیں بعد میں ادراک و شعور پیدا ہونے کے بعد محض ماحول کے اثر سے ابھرتے ہیں لیکن یہ خیال محض مغالطہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ماحول اپنے اندر نئے آنے والوں پر جو اثرات ڈالتا ہے وہ خود اس نے کہاں سے لیے ہیں۔ ماحول کے پاس رطب و یابس روایات کا جو اندوختہ بھی ہے وہ سب اس کی فطرت ہی کے بناؤ یا بگاڑ کا کرشمہ ہے جو باتیں اس کی فطرت کے اصل منبع سے ابھری ہیں وہ خیر، عدل اور معروف ہیں اور جن پر ان کی خواہشات کی بے اعتدالیاں غالب آگئی ہیں وہ شر اور ظلم بن گئی ہیں۔ خدا کے معاملے میں بھی یہی بے اعتدالی اس سے صادر ہوئی ہے۔ اس کی اصل فطرت کے اندر صرف ایک خدائے وحدہ لاشریک ہی کا اقرار مضمر ہے۔ اتنے پر دنیا کے مشرک اور موحد سب متفق ہیں اس وجہ سے یہ چیز کسی دلیل کے قیام کی محتاج نہیں ہے البتہ شرک کے مدعیوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ایک پر جو دوسرے معبودوں کا اضافہ کرتے ہیں ان کی وہ دلیل پیش کریں چنانچہ قرآن نے ان سے جگہ جگہ یہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ شریکوں

کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔

قرآن کا سارا فلسفہ درحقیقت انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جن عقائد و اعمال اور جن اچھائیوں اور نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے اور جن برائیوں سے روکتا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے خارج سے اس پر لادی نہیں جا رہی ہے بلکہ اس کو انہی باتوں کی یاددہانی کی جا رہی ہے جو اس کی اپنی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن اس نے اپنی لذات عاجلہ کے پیچھے پڑ جانے کے سبب سے ان کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ قرآن نے اس وجہ سے اپنے آپ کو 'ذکر' اور 'ذکریٰ' کہا ہے جن کے معنی یاددہانی کے ہیں اور اپنی تعلیم دعوت کو 'تذکیر' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی فراموش کردہ یا نظر انداز کردہ حقائق کے یاد دلانے کے ہیں۔

یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے لیکن اس زمانے کے نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر مارکس اور فرائڈ کا جادو چلا ہوا ہے۔ ان ظالموں کی خاکبازیوں نے لوگوں کو اس طرح اندھا بنا دیا ہے کہ اب لوگوں کو انسان کے اندر بطن اور فرج کے سوا اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ ان کے نزدیک انسان کا سارا فکر و فلسفہ بس انہی دو محوروں پر گھوم رہا ہے۔ اس روایتی چوہے کی طرح جسے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی تو اس نے پنساری کی ایک دکان کھول لی، مارکس اور فرائڈ نے بھی بطن و فرج پر سارے فکر و فلسفہ اور تمام مذہب و اخلاق کو ڈھال دیا اور اس طرح ان لوگوں کو جو پہلے ہی بطن و فرج کے غلام تھے دو ایسے مرشد بھی مل گئے جن کا وہ فخر کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں کہ وہ بے پیرے نہیں ہیں بلکہ انھیں بھی شرف نسبت و ارادت حاصل ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَاۗءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۷۵-۱۷۸)

'وَاتْلُ عَلَيْهِمْ الاٰیۃ'۔ 'هُمْ' سے مراد قریش ہیں جن کو اوپر والی آیات میں مخاطب کر کے عہد فطرت کی یاددہانی کی گئی ہے۔

یہود کی تمثیل

'الَّذِيْ' اگرچہ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے لیکن تمثیلات میں یہ لازم نہیں ہے کہ اس سے کوئی معین شخص ہی مراد ہو جو خارج میں بھی موجود ہو بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے اس کو نگاہ میں رکھ کر اس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعہ کی تصویر کشی ہوتی ہے اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اس کو نکرہ کے بجائے معرفہ کے لفظوں میں ذکر کیا جائے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی صورت میں متشکل ہو کر اس طرح سامع کے سامنے آجائے

کہ گویا اس نے اس کی سرگزشت صرف سُنی ہی نہیں بلکہ خود اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ یہاں اس 'الَّذِیْ' سے مراد یہود من حیث القوم ہیں جن کی تمثیل ایک ایسے شخص سے دی گئی ہے جس کو خدا نے اپنی آیتوں سے نوازا لیکن اس نے ان کی قدر نہ کی بلکہ یہ خلعت اس نے اتار پھینکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سنتِ الٰہی کے مطابق جو سورۂ زخرف آیت ۳۶ میں بیان ہوئی ہے کہ 'وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ' (جو خدائے رحمان کی یاد دہانی سے منہ پھیرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے) شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے بن گیا۔ یہ بات کہ یہ کسی معین شخص کا ذکر نہیں بلکہ خدا کی آیات کی تکذیب کرنے والی ایک قوم کی تمثیل ہے خود قرآن کے الفاظ ہی سے واضح ہے چنانچہ اس کے بعد فرمایا 'ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا' (یہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی) اس وجہ سے ہمارے نزدیک 'الَّذِیْ' سے کسی بلعام بن باعور کو مراد لینے کی ضرورت نہیں۔ یہود میں کوئی ایک ہی بلعام بن باعور نہیں تھا جس کی مثال دی جائے۔ اوپر یہود کی تفصیل کے ساتھ جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے خود واضح ہے کہ یہ پوری قوم کی قوم ہی شروع سے ہی بلعام بن باعور بنی رہی ہے۔ 'انسلاخ' کے معنی کپڑے اتار کر ننگے ہو جانے کے ہیں۔ 'انْسَلَخَ مِنْ ثِیَابِهٖ، تجرد' یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کو اپنی کتاب کی تشریف و خلعت سے نوازا لیکن انھوں نے یہ اتار پھینکی اور بالکل ننگے الف بن کر رہ گئے۔

'وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ'، 'اَخْلَدَ اِلَی الشَّیْءِ' کے معنی کسی شے کی طرف اس طرح جھک جانے اور مائل ہو جانے کے ہوتے ہیں کہ آدمی بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔ یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے اگر وہ ان کی قدر کرتے ہیں تو وہ ان کے ذریعہ سے ان کو دین و دنیا دونوں کی سرفرازی عطا فرماتا ہے، ان کی عقل کو ان سے رفعت اور ان کی روح کو ان سے معراج حاصل ہوتی ہے، لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے اور کُتّے کی طرح زمین کو سونگھتے ہی ہوئے چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اُن کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

یہود کی تمثیل کُتّے سے

'فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ'۔ اب یہ ان کے برابر پستی کی طرف جھکے رہنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کی تمثیل بیان ہوئی ہے اور دیکھیے کیسی دلنشین اور مطابق واقعہ تمثیل ہے۔ اوپر آیات ۱۶۸-۱۶۹ میں ان کا حال یہ بیان ہوا تھا کہ خدا نے اپنے انعامات اور اپنی تنبیہات دونوں سے ان کو آزمایا (بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ) لیکن یہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں ایسے بے بس رہے کہ نہ انعامات سے ذرا متاثر ہوئے نہ تنبیہات سے بلکہ ہر طمع نے ان کو ٹھوکر کھلائی

اور ہر خواہش کے آگے انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے (یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ) ان کی اس حالت کی تمثیل کتے سے دی ہے۔ کتے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ کبھی بخطِ مستقیم گردن اٹھا کر نہیں چلتا بلکہ ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا اور ہر پاک و ناپاک چیز کا اپنی ناک سے جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اس کی رہنما اس کی آنکھ نہیں بلکہ ناک ہوتی ہے جو اس کی خواہشوں کی سُراغ رساں ہے۔ پھر اس کی یہ بھی خصلت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان نکالے ہوئے رہتا ہے، چمکاریے، پیار کیجیے جب بھی اس کی یہی حالت رہے گی، دھتکاریے، جھڑکیے جب بھی اس کا یہی انداز رہے گا۔ یہ اس کی حرص اور دناءت ہے جو اس کی جبلت پر اس طرح غالب ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔ بھوکا رہے گا جب بھی اس کو آپ اسی حال میں پائیں گے، پیٹ بھر کے کھلا دیجیے جب بھی اسی ہیئت میں دیکھیں گے۔ صاحبوں کے کتے مخملیں جھول، ریشمی پٹوں اور چاندی کے گھنگروؤں سے آراستہ ہوتے ہیں، پیٹ بھر گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہیں لیکن کار کے اندر صاحب کی بغل میں بیٹھے ہوئے بھی زبان نکالے ہوئے رہیں گے اور پارک کے اندر سیر کرتے ہوئے بھی زمین میں تلاش کرتے، سونگھتے اپنی ناک کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ فرمایا کہ بالکل یہی حال یہود کا ہے۔ ان کو اپنے نفس پر ذرا قابو نہیں رہا ہے۔ ان کی قوتِ ارادی بالکل معطّل ہو چکی ہے۔ اب یہ اپنی خواہشوں کے غلام اور اپنی حرص کے بندے ہیں اور حرص و دناءت ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ ان کی شکلیں آدمیوں کی ہیں لیکن ان کی فطرت کتوں کی جبلت کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

آیت میں 'تَحْمِلْ عَلَيْهِ' میرے نزدیک 'تَحْمِلِ الْعَصَا عَلَيْهِ' یا 'تَحْمِلِ الْحَجَرَ عَلَيْهِ' کے معنی میں ہے یعنی لکڑی اٹھاؤ یا اس پر پتھر پھینکو اس کا حال ایک ہی رہے گا۔ 'لَهَثَ' کے معنی زبان نکالنے کے ہیں اور اس کا غالب استعمال کتے کے لیے ہے۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا الاٰيٰتِنَا اس ٹکڑے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تمثیل کسی شخص کی تمثیل نہیں بلکہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ اور اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، یہود ہیں۔ سورۂ نحل آیات ۹۱-۹۲ کے تحت انشاء اللہ ہم تمثیل کے اس پہلو پر مزید بحث کریں گے۔

یہود کی یہ تمثیل، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، قریش کو سنائی گئی ہے اور مقصود اس سے قریش کو اس نعمت کی قدر کرنے کے لیے ابھارنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری شریعت کی شکل میں ان کو مل رہی تھی لیکن وہ اس کی قدر کرنے کے بجائے اس سے بدک رہے تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان کو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والی قوم کا حال سُنا دو کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی آیات سے نوازتا ہے ان کو وہ ان آیات کے ذریعہ سے زمین و آسمان دونوں کی سرفرازیاں عطا فرمانا چاہتا ہے بشرطیکہ وہ

ان کی قدر کریں، ان کو اپنائیں اور زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ اگر وہ قدر نہیں کرتے بلکہ اپنی خواہشات ہی کے غلام بنے رہتے ہیں تو ان کا حال وہی ہوتا ہے جو یہود کا ہوا۔

'سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ' مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرنے والی قوم اپنی خواہشات کی غلامی کے سبب سے بالکل ہیز بن کے رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال، جیسی کہ اوپر بیان ہوئی، نہایت ہی مکروہ اور گھنونی ہے۔ سو یہ راہ تم نہ اختیار کرو۔ جو لوگ یہ راہ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی آیات کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ وہ ان آیات کی ناقدری کر کے خود اپنے ہاتھوں عزت کے تاج کے بجائے اپنے لیے ذلت کا طوق اختیار کرتے ہیں۔

'مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور قریش کے لیے تہدید و وعید بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت وہی پائیں گے جن کو خدا ہدایت کی توفیق بخشے اور خدا کی توفیق انہی کو حاصل ہوتی ہے جو ہدایت کے طالب ہوں اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ جو لوگ اپنی آنکھوں اور اپنے دل و دماغ پر خواہشات کی پٹی باندھ کر زندگی گزارتے ہیں خدا انھیں گمراہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور اصلی نامراد اور بدقسمت لوگ وہی ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۷۹)

ہدایت سے محروم رہنے والے

اب یہ بتایا کہ کون لوگ ہیں جو ہدایت سے محروم رہتے ہیں اور بالآخر وہ جہنم کے ایندھن بنتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ جنوں اور انسانوں میں سے وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے دل تو دیے ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو آنکھیں تو بخشیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو کان تو عنایت فرمائے لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ سمجھنا، دیکھنا اور سننا اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں بس اپنی خواہشات کی تابعداری میں لگا رکھی ہیں۔ ان سے ہٹ کر کسی چیز کو سننے سمجھنے اور اس کو اختیار کرنے کا ان کے اندر دم داعیہ نہیں پایا جاتا۔ فرمایا کہ یہ لوگ چوپایوں کے مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ بے عقل ہیں۔ چوپایوں کے مانند اس وجہ سے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب و جستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے اسی طرح ان کی تگ و دو بھی اپنی مادی ضروریات و خواہشات ہی تک محدود ہے اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اس وجہ سے ہیں کہ چوپائے بہرحال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ بسا اوقات اس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو ایک بیل یا گدھے سے کبھی صادر نہیں ہوتیں۔ مثلاً انسان انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں، پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے لیکن ایک

گدھا یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو اصلی اور حقیقی بے خبر ہیں اس لیے کہ یہ بے خبری چوپایوں میں بھی نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ جو فرمایا ہے کہ ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو ان کی ماؤں کے پیٹ سے جہنم کے لیے پیدا کیا۔ ماؤں کے پیٹ سے تو اللہ تعالیٰ نے دل، دماغ، سمع، بصر کی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن ضابطہ یہ بنا دیا ہے کہ جو ان صلاحیتوں سے صحیح فائدہ اٹھائیں گے اللہ ان کی رہنمائی جنت کی طرف فرمائے گا اور جو ان سے فائدہ نہ اٹھائیں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہ دھمکی قریش کے لیے ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۸۰)

اللہ تعالیٰ صرف اچھی صفتوں سے متصف ہے

یہ آیت، اوپر آیت ۱۷۲ میں توحید کا عہد فطرت ہونا جو بیان ہوا ہے، اس سے متعلق ہے۔ بیچ میں ان لوگوں کا ذکر آ گیا تھا جنھوں نے اللہ کی آیات کی قدر نہیں کی اور خدا کی طرف سے نہایت اعلیٰ صلاحیتیں پا کر اندھے بہرے بن گئے۔ اب یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے صرف اچھی ہی صفتیں اور اچھے ہی نام ہیں تو اس کو انھیں صفتوں سے پکارو اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جو صفات الٰہی کے باب میں گمراہی کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں، اس کے شریک ٹھہراتے ہیں یا اس کے بیٹے بیٹیاں مانتے ہیں۔ یہ باتیں خدا کی صفات الوہیت، اس کی شان یکتائی، اس کی قدرت، اس کی بے نیازی اور اس کے علم کی نفی کرنے والی ہیں۔ خدا کو صرف انہی صفات سے متصف کرنا چاہیے جن کا اس کی الوہیت اور اس کی بے ہمگی و بے ہمتائی کے ساتھ جوڑ ہو سکے، کوئی ایسی صفت اس کی طرف منسوب نہیں کرنی چاہیے جو خالق کو مخلوقات کی صف میں لا کر کھڑا کر دے۔ 'الحاد' کا لفظ یہاں صفاتِ الٰہی کی بے حرمتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ عربی میں اگر کہیں 'فلان الحد فی الحرم' تو اس کے معنی ہوں گے 'استحل حرمته وانتهكها'۔ 'يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ' کے معنی ہوئے جو خدا کی صفات کی بے حرمتی و بے توقیری کرتے ہیں یعنی اس کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ لگاتے ہیں جو اس کی ذات و صفات کی اہانت کرنے والی ہیں اور جن سے وہ پاک و برتر ہے۔ یہ جو فرمایا کہ 'ان کو چھوڑ دو' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اگر نہیں مانتے تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ 'سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی سزا عنقریب خود بھگتیں گے۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۸۱)

مُردوں کے اندر زندہ بھی ہیں

یعنی خدا کی مخلوق میں سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں۔ اگر ایک طرف وہ اندھے بہرے ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا تو کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں، حق کو پہچانتے ہیں، اسی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور معاملات کے فیصلے کرتے ہیں۔ اوپر آیت ۱۵۹ میں جس طرح بنی اسرائیل کے اندر کے اچھے لوگوں کا ذکر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی ہے اسی طرح یہاں 'وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ' الآیہ کے مرگ انبوہ کے ذکر کے بعد ان زندہ روحوں کی طرف اشارہ کر دیا جن کی فطرت اس وبائے عام اور اس مرگِ انبوہ کے اندر بھی زندہ رہی اور جو بالآخر اسلام

کے نور سے منور ہوئے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (۱۸۲-۱۸۳)

خدا کی ڈھیل ہلاکت کا پھندا ہے

اوپر آیت ۱۸۰ میں آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کو جو دھمکی دی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلانے کے باوجود دندنا رہے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ خدا کی پکڑ سے باہر ہیں۔ ہم ان کو وہاں سے اپنے ہدف پر لا رہے ہیں جہاں سے ان کو کسی خطرے کا سان گمان بھی نہیں ہے۔ ہم نے ان کو جو ڈھیل دی ہے اس کو یہ اپنی جیت سمجھے ہیں حالانکہ یہی ڈھیل ان کی ہلاکت کا پھندا ہے۔ ہم نے یہ ڈھیل اس لیے دی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ جب شکاری کو اپنی ڈور پر پورا اعتماد ہوتا ہے تو وہ مچھلی کو آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے، مچھلی سمجھتی ہے کہ اب اس نے بازی مار لی حالانکہ شکاری اس لیے اس کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا ہی زور لگائے لیکن وہ اس کے قابو سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس کی بھاگ دوڑ اس کے لیے نجات کی راہ نہیں کھولے گی بلکہ اس کو تھکا کر اتنا چور کر دے گی کہ بالآخر وہ بے جان ہو کر خود بخود گھسٹتی ہوئی کنارے پر آ لگے گی۔ یہی حال خدا کی تدبیر کا ہے۔ اس کی تدبیر نہایت محکم اور اس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اس ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ جتنی ہی زور آزمائی کرتے ہیں اتنے ہی اپنی ہلاکت کے گڑھے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ جلد بازی وہ کرتا ہے جس کو اپنی تدبیر کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کا تیر بے خطا اور جس کا وار بے پناہ ہو اس کو جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔

'اِسْتَدْرَجَہٗ' کے معنی ہیں 'دقاہ من درجۃ الی درجۃ' 'خدعہ' اس کو آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ چڑھا لایا، اس کو چکمہ دے دیا، یہ اللہ تعالیٰ کے فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ ہے جس میں اس کے باغی مبتلا کیے جاتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۸۴-۱۸۶)

آنحضرت صلعم پر جنون کا الزام

'صَاحِبِهِمْ' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے قریش کو اس امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ پیغمبر ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ ان کے دن رات کے ساتھی ہیں۔ ان کا بچپن، ان کی جوانی سب انہی کے اندر اور انہی کے ساتھ گزری ہے۔ ہر دور اور ہر مرحلہ میں انھوں نے ان کو دیکھا اور آزمایا اور ہر طرح کے حالات میں ان کو جانچا اور پرکھا ہے۔ پھر آخر یہ اس امر پر کیوں نہیں غور کرتے کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاکبازی، اپنی فکر و رائے کی

اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں گل سرسبد رہا دفعتہً وہ اب خبطی اور دیوانہ کیسے بن گیا؟ آخران میں دیوانوں اور خبطیوں کی سی کون سی بات ان کو نظر آئی؟ یہ دیوانے اور خبطی نہیں ہیں بلکہ جس طرح ایک نذیر عریاں، خطرے کے دیدبان سے اپنی قوم کو دشمن کے حملہ سے ہوشیار کرتا ہے اسی طرح یہ خدا کے نذیر مبین ہیں جو آنے والے وقت اور تم پر نازل ہونے والے عذاب سے تم کو ڈرا رہے ہیں۔ ان کے اندر تمھیں ہوشیار و بیدار کرنے کے لیے جو بے قراری و بے چینی ہے اور انھوں نے تمھارے پیچھے اپنے رات دن جو ایک کر رکھے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے دماغ میں کوئی خلل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عظیم خطرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور جو تمھیں بے بصیرتی کے سبب سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ یہ جنون نہیں بلکہ حقیقت کا سچا احساس اور اپنی قوم کی محبت کا بے پایاں جذبہ ہے جو انھیں ہلکان کیے ہوئے ہے۔ یہ تمھاری انتہائی بلادت، ناسپاسی اور سنگ دلی ہے کہ تم اس کو خبط اور جنون قرار دیتے ہو۔

یہ واضح رہے کہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مجنون کہتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ فی الواقع آپ کو کوئی مجنون سمجھتے تھے۔ آخر قریش کے ذہین لوگ اتنے کودن کیسے ہو سکتے تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پیکر متانت و رزانت کو مجنون کہیں؟ پھر وہ کہتے تو ان کی بات کو لائق اعتنا کون مانتا؟ اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رات دن جو اس بات کی لگن تھی کہ اپنی قوم کو اس آنے والے عذاب سے ڈرائیں جو سنت الٰہی کے بموجب، رسول کی تکذیب کی صورت میں، لازماً ان پر آ دھمکتا، یہ چیز قریش کے لیڈروں کو بہت عجیب معلوم ہوتی، ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آخران پر عذاب کدھر سے آ جائے گا اور کیوں آ جائے گا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے صاحب کردار شخص کا اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر، رات دن ان کو اس عذاب سے ڈرانا اور اس جزم و یقین کے ساتھ ڈرانا کہ گویا آنے والے طوفان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، ایسی صورت حال نہیں تھی جس کو قریش کے لیڈر نظر انداز کر سکیں۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کی کوئی توجیہ تلاش کریں۔ اس کی کوئی توجیہ تلاش کرنا یا گھڑنا ان کی سیاسی مصلحت کا بھی تقاضا تھا اس لیے کہ ان کے اندر جو لوگ خالی الذہن تھے، کسی پندار یا کسی خود غرضی میں مبتلا نہ تھے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے لوثی اور دردمندی سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کو اس اثر سے بچانے اور اپنی سیادت کی دھاک قائم رکھنے کے لیے انھوں نے یہ اشغلا چھوڑا کہ جس طرح بھلے چنگے آدمی کو بھی بسا اوقات کسی چیز کا خبط اور سودا ہو جایا کرتا ہے، رات دن اس پر وہی دھن سوار رہتی اور اٹھتے بیٹھتے ہر جگہ اسے وہی چیز نظر آتی ہے اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی نعوذ باللہ عذاب اور قیامت کا سودا لاحق ہو گیا ہے، ان کی یہ چیز پروا کرنے کی نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں قریش کی اسی طفل تسلی کی تردید کی ہے کہ جس شخص کو تم مدت العمر کے تجربہ سے جانتے ہو کہ توازن فکر و عمل اور اعتدال ذہن و مزاج کے اعتبار سے تمھاری پوری قوم میں کوئی اس کا

ثانی نہ ہُوا آج تم اس کو خبطی اور دیوانہ قرار دیتے ہو جب وہ سن و سال اور رشد و کمال دونوں کی پختگی کا ایک پیکر قدسی ہے۔ نادانو، یہ دیوانہ نہیں بلکہ ایک کھُلا ہوا ہوشیار کرنے والا اور ڈرانے والا ہے جو آنے والے طوفان کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ تو ع

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

پیغمبر کی تائید میں آفاق کی شہادت

'اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ' مطلب یہ ہے کہ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ انھیں جو عذاب اور قیامت سے ڈرا رہا ہے وہ دیوانہ اور خبطی نہیں ہے بلکہ یہ خود اندھے اور بہرے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی صدا اس کائنات کے گوشے گوشے سے اٹھ رہی ہے۔ جو شخص بھی اس کائنات کے نظام پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ کائنات عبث اور بے غایت و بے مقصد نہیں ہے بلکہ یہ لازماً ایک روز جزا و سزا پر منتہی ہونے والی ہے جس میں فلاح صرف وہی لوگ پائیں گے جو راستی و پاکبازی کی زندگی بسر کریں گے، جو لوگ اس راہ سے ہٹ کر چلیں گے وہ جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ یہ اس مجموعی نظام کائنات کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف وہی لوگ جھٹلا سکتے ہیں جو عقل و شعور کے کان اور آنکھ بند کیے بیٹھے ہوں۔ پھر اس مجموعی کائنات کا ایک ایک جزو بھی اسی حقیقت نفس الامری کی شہادت پکار پکار کر دے رہا ہے۔ خدا نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ اس کی قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کا مظہر ہے اور اس نے اس کے لیے ایک مدت بھی ٹھہرائی ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ جس حکیم و قدیر ذات کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہے وہ اس دنیا کو یوں ہی چھوڑے رکھے، اس کے خیر و شر میں کوئی امتیاز نہ کرے اور جس نے ہر چیز کے لیے ایک اجل معین کی وہ اس مجموعی دنیا اور اس کی قوموں کے لیے کوئی اجل معین نہ کرے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ آسمان و زمین کے نظام میں غور جس نتیجہ تک آدمی کو پہنچاتا ہے اس کے ایک حصّہ کو، جو واضح ہے، یہاں حذف کر دیا ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی کہ "کیا انھوں نے آسمان و زمین کے نظام اور اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں غور نہیں کیا کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اللہ نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا"۔ بعض جگہ اس محذوف کو واضح کر دیا ہے۔ مثلاً یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ ۱۹۱۔ آل عمران (اور وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا، تو پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو)

'وَاَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُھُمْ' یہ اسی محذوف پر عطف ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ یعنی اگر یہ آسمان و زمین کے نظام اور مخلوقاتِ الٰہی کی حکمتوں پر غور کرتے تو ان پر اس کائنات کا بامقصد اور ایک اجل معین کے لیے ہونا بھی واضح ہو جاتا اور ان پر یہ بات بھی کھل جاتی کہ کیا عجب کہ

اب ان کی وہ اجل بھی قریب آ لگی ہو، جس سے پیغمبر ان کو ہوشیار کر رہے ہیں اس لیے کہ جب اس دنیا کو خدا نے کھیل تماشہ نہیں بنایا ہے تو آخر وہ ان کو شتر بے مہار کی طرح کیوں چھوڑے رکھے گا، جس طرح دوسری قوموں کو، جن کی تاریخ اوپر بیان ہوئی، اللہ نے پکڑا اب انھیں بھی پکڑے تو کیا بعید ہے! — یہ گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں آفاقی شہادت کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کو خبط پر محمول نہ کرو بلکہ اپنی بلادت اور سرگشتگی پر ماتم کرو۔

وقت گزر جانے کے بعد ایمان بے فائدہ ہے۔

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ، 'بَعْدَهٗ' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں دو قول ہو سکتے ہیں، ایک اجل، جس کا ذکر اوپر گزرا، اور دوسرے قرآن جس کی آیات کی تکذیب کا یہ سارا نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے۔ استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان دوسرے قول کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن میرا رجحان غالب پہلے قول کی طرف ہے کہ جب وہ اجل آ دھمکے گی تو پھر کس بات پر ایمان لائیں گے۔ ایمان لانے کا وقت تو اب ہے لیکن یہ منتظر ہیں کہ پیغمبر جس انجام کی دھمکی سنا رہے ہیں اس کو دیکھ لیں گے تب ایمان لائیں گے لیکن ان بدبختوں سے کوئی پوچھے کہ پھر ایمان لانے کے لیے کون سی بات باقی رہ جائے گی جس پر وہ ایمان لائیں گے؟ پھر تو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا، جھگڑا جس چیز کے ماننے نہ ماننے کا ہے وہ تو اسی وقت تک ہے جب تک اس کا ظہور نہیں ہوتا، جب وہ ظاہر ہو گئی تو ماننا تو کیا، انکار کیا تو کیا۔ پھر تو نتیجہ بھگتنا ہے نہ کہ کوئی چیز ماننے کے لیے باقی رہ جائے گی جس پر ان سے ایمان لانے کے لیے کہا جائے گا۔

'مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ الآیۃ' اوپر والا ٹکڑا، جیسا کہ واضح ہے، حسرت کے انداز میں ہے۔ اسی مضمون کی یہ تاکید مزید ہے کہ جن لوگوں کی سمجھ میں اتنی واضح بات نہیں آ رہی ہے درحقیقت وہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور جو لوگ سنت الٰہی کی زد میں آ چکے ہوں ان کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ ایسے لوگ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۸۷)

سوال بطور استہزا

'یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا' سوال، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، مذاق اور استہزا کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ اسی نوعیت کا سوال مراد ہے۔ 'سَاعَة' کے معنی وقت اور گھڑی کے ہیں۔ یہاں مراد اس عذاب اور قیامت کی گھڑی ہے جس کے دفعۃً آ دھمکنے کا ڈراوا ان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنا رہے تھے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کو دو عذابوں سے ڈراتا ہے۔ ایک اس عذاب سے جو اسی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے، اگر اس کی قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے، دوسرے اس عذاب سے جس سے کفار قیامت میں دوچار ہوں گے۔ 'اَلسَّاعَة' کا لفظ دونوں ہی پر حاوی

ہے اس لیے کہ پیغمبروں کو جھٹلانے والے ان دونوں ہی کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ 'ایان' وقت سے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔ جس طرح 'متیٰ' آتا ہے۔ لیکن یہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی چیز سے متعلق استغراب و استنکار کے لب و لہجہ میں سوال کیا جائے۔ 'مُرْسٰی' جہاز وغیرہ کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں (مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا) مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے استہزاء اور طنز کے انداز میں سوال کرتے ہیں کہ اس عذاب یا قیامت کی گھڑی کب نمودار ہو گی جس کے اتنے دنوں سے ڈراوے سنا رہے ہو، آخر یہ جہاز چلا تو کہاں اٹک کے رہ گیا، یہ ساحل پر کب لنگر انداز ہو گا۔

'قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ' فرمایا کہ کہہ دو کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا، نہ مجھے اس کے وقت کا پتہ ہے اور نہ میں اس کے لا سکنے پر قادر ہوں۔

ایک اعلیٰ تلمیح

'ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' اس کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ یہ آسمان و زمین میں ایک بھاری حادثہ ہو گا۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن اسلوب بیان ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ وہ گھڑی آسمان و زمین میں ایک بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اس میں اس حقیقت کی طرف ایک تلمیح ہے کہ جس طرح ایک حاملہ عورت، ولادت کے قریب بار حمل سے گرانبار ہوتی ہے، اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ولادت کا صحیح وقت کیا ہے لیکن ہر آنکھیں رکھنے والا دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ عورت جنے گی اور بہت جلد جنے گی وہی حال قیامت اور عذاب کے معاملے میں آسمان و زمین میں غور کرنے والے ارباب بصیرت کا ہے وہ آسمانوں اور زمین کو اس بوجھ سے گرانبار دیکھتے ہیں اور اگرچہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس بوجھ سے کب سبکدوش ہوں گے لیکن جس طرح ایک حاملہ اپنے آخری مرحلہ میں اپنے بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لیے منتظر اور بے قرار ہوتی ہے، وہی بے قراری آسمان و زمین کے اندر نمایاں ہے۔ اس میں اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو آسمان و زمین کے اندر قیامت اور عذاب کی نشانیاں نظر نہیں آ رہی ہیں ان کو گویا آخری مرحلہ میں پہنچی ہوئی حاملہ کا حمل نظر نہیں آ رہا ہے 'لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' یعنی اس کے علامات و آثار دیکھو اور انہی کو دیکھ کر اس کے آنے کا یقین کرو اور اس کے لیے تیاری کرو، اس کا ظہور جب بھی ہو گا، اچانک ہو گا، اس کے صحیح وقت کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن اس کے وقت کے نہ جاننے سے اس کے واقع ہونے کی نفی نہیں ہو جاتی۔ ایک حاملہ کے متعلق ہر شخص یقین رکھتا ہے کہ وہ جنے گی اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس وقت جنے گی۔

'حفی' کا مفہوم

'یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا' 'حفیٌ' اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شخص یا کسی چیز کی کھوج کرید، دریافت، جستجو اور اہتمام کے درپے رہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے اس گھڑی کے وقت کے ظہور کے متعلق اس طرح سوال کر رہے ہیں گویا تم رات دن اس کے وقت ہی کی دریافت کے درپے رہتے ہو اور تم نے

منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ ساری معلومات اس کے متعلق جمع کر رکھی ہیں حالانکہ کوئی عاقل نہ کسی ایسی جستجو کے درپے ہوتا نہ اس کو ہونا چاہیے جو اس کے حدود علم و تحقیق سے ماورا ہو۔

انسان کی عجیب بدبختی

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ کیا چیز ان کے جاننے کی ہے جس کے انھیں درپے ہونا چاہیے اور کیا چیز ان کے حدود علم سے ماورا ہے جس کے پیچھے پڑنا محض اوقات کی اضاعت اور اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کرنا ہے۔ انسان کی یہ عجیب بدبختی ہے کہ وہ زیادہ تر ان چیزوں کے پیچھے پڑتا ہے جن کو نہ تو وہ جان سکتا ہے نہ وہ اس کے جاننے کی ہیں اور پھر ان کو بہانہ بنا کر ان حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے جن کو جاننا اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ متشابہات کے پیچھے پڑ کر محکمات کا انکار کرتے ہیں ان کی بھی اصلی بیماری یہی ہے۔ اس پر ہم نے آل عمران کی تفسیر میں مفصل بحث کی ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۭ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۸۸)

پیغمبر غیب کا عالم نہیں ہوتا

یعنی ان کو بتا دو کہ میں جو اللہ کا رسول ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں سارے غیب کا عالم ہو گیا ہوں اور مجھے اس بات کا اختیار مل گیا ہے کہ میں اپنے آپ کو جس نفع سے چاہوں بہرہ ور کر لوں اور جس نقصان سے بچانا چاہوں بچا لوں۔ غیب کا عالم اور حقیقی نافع و ضار صرف اللہ ہی ہے۔ دوسروں کی طرح میرے معاملات میں بھی اصلی کارفرما خدا کی مشیت ہی ہے۔ میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے نہ کہ خدائی کا تو مجھ سے ان چیزوں کا مطالبہ نہ کرو جن کا تعلق صرف خدا کے ارادے اور اختیار میں ہے۔ مجھے وحی عطا ہوئی ہے، علم غیب کی کنجیاں مجھے نہیں ملی ہیں۔ اگر مجھے غیب کا علم مل گیا ہوتا تو میں خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند بھی نہ پہنچ پاتا لیکن تم دیکھتے ہو کہ مجھے مختلف قسم کے گزند بھی پہنچتے ہیں اور خیر کی راہوں میں بھی میری سبقت اسی حد تک ہے جس حد تک مجھے رب کی مرضیات کا علم ہے۔ 'لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ' کے ٹکڑے میں جس خیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کر لینے کی تمنا کا اظہار ہے وہ پیغمبر کے ظرف اور اس کی طلب کے اعتبار سے ہے۔ پیغمبر اپنے حوصلہ اور اپنے ارمان کے اعتبار سے اس مقام بلند پر ہوتا ہے کہ وہ خیر کی کسی وادی کو ناطے کردہ نہیں چھوڑنا چاہتا لیکن وہ خیر سے واقف اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک اس کو وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کو پورا غیب معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے اپنے امکان کے حد تک تو اس کی کوشش یہی ہو گی کہ خیر کی راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ لیکن دائرہ وحی سے باہر اسے بھی دوسروں کی طرح اپنی صواب دید ہی پر کام کرنا اور اپنی عقل ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی دونوں کے امکانات مضمر ہوتے ہیں۔

'اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ میں نہ

عالم الغیب ہوں نہ صاحب اختیار مطلق۔ میں تو صرف ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ میرے اختیار میں یہ بھی نہیں ہے کہ کسی کے دل میں ایمان اتار دوں، یہ چیز بھی لوگوں کے اپنے ارادے اور اللہ کی توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (۱۸۹-۱۹۰)

اضداد کی باہمی سازگاری توحید کی دلیل ہے

'هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا' اس ٹکڑے کے مضمرات پر ہم سورۂ نساء آیت ا کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہاں 'جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ مرد اور عورت کا باہمی تعلق کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی فطری مناسبت تو نہ ہو، محض اتفاق سے وہ ایک دوسرے کے لیے سازگار، ہم جنس، سرمایۂ تسکین، راحت جان و دل اور ذریعۂ اولاد و احفاد بن گئے ہوں بلکہ سورج کی طرح یہ چیز روشن نظر آتی ہے کہ خالق کائنات نے مرد کے اندر عورت کے لیے اضطراب اور تڑپ پیدا کی ہے اور پھر اس کے اس اضطراب اور اس کی اس تڑپ کی تسکین ہی کے لیے اسی کی جنس سے عورت کو وجود بخشا ہے۔ ان دونوں میں ان کے فطری داعیات اور ان کی داخلی اور خارجی ساخت کے اعتبار سے ایسی گہری سازگاری ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی نہیں یہ کہہ سکتا کہ یہ سازگاری کسی اندھے بہرے مادے کی پیدا کردہ ہے یا یہ کہ ان کا ارتقا آپ سے آپ خودرو درختوں کی طرح ہوا پھر دونوں اپنے اپنے طور پر بھٹکتے ہوئے کہیں راستے میں مل گئے تو اچانک تڑپ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے اور پھر اس طرح باہم دگر جان و تن بن گئے۔ ع

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پھر یہ سازگاری، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس حقیقت کا بھی پتہ دیتی ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک ہی حکیم و علیم کا ارادہ کار فرما ہے۔ اگر اس میں مختلف ارادے کار فرما ہوتے تو اس کے اضداد کے اندر وہ سازگاری کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں متضاد خصوصیات سے متصف ہیں لیکن مدبر کائنات نے ان دونوں کے درمیان اس طرح جوڑ ملایا ہے کہ ایک نے درد اور دوسری نے دوا کی شکل اختیار کر لی ہے۔

سائنس کا ایک انکشاف

'جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا' پر غور کرتے ہوئے جدید سائنس کے اس انکشاف کو بھی ذہن میں رکھیے کہ زندگی کے آغاز میں جسد انسان کی اولین صورت ایک جونک کی طرح ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھی اور ایک خلیہ کے جاندار کے توالد کا طریق یہ ہے کہ وہ بڑھ کر خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جن میں سے ہر ایک حصہ ایک مکمل جاندار ہوتا ہے۔ پھر بدتی ارتقا کے اگلے مراحل پر ایک حصہ مادہ کے فرائض کے لیے اور دوسرا حصہ

نر کے فرائض کے لیے موزوں بن جاتا ہے۔[1]

ایک عام انسانی کمزوری کا بیان

فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ آیات ۱۲۴-۱۲۵ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ تصویرِ حال کے مواقع میں 'لَمَّا' 'کُلَّمَا' اور 'اِذَا' کی جگہ پر بھی استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں کسی خاص شخص کا حال یا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ عام انسانوں کا حال بیان ہو رہا ہے کہ باوجودیکہ مرد اور عورت دونوں کو خدا ہی نے بنایا اور ان کی باہمی سازگاری دلیل ہے کہ ایک خدا کے سوا ان کے بنانے میں کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے لیکن انسان کی یہ عجیب خرد باختگی ہے کہ جب اولاد پیدا ہونے والی ہوتی ہے تب تو میاں بیوی دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بھلی چنگی اولاد عطا فرما لیکن جب اللہ ان کو بھلی چنگی اولاد دے دیتا ہے تو اس کو منسوب کسی درگاہ و خانقاہ اور کسی بزرگ یا کسی بت کی طرف کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں کی توجہ اور فلاں کی برکت و عنایت کا کرشمہ ہے۔ بعض لوگوں نے "لَمَّا" کی وجہ سے اس کو ایک معین واقعہ سمجھا اور جب معین واقع سمجھا تو ضروری ہوا کہ اس کو کسی خاص شخص کی طرف منسوب کریں چنانچہ انھوں نے اس کو حضرت آدمؑ اور حوا کی طرف نسبت دے دی اور اس کے لیے ایک بے بنیاد واقعہ بھی گھڑ کر تفسیروں میں شامل کر دیا حالانکہ قطع نظر اس سے کہ حضرت آدمؑ پیغمبر ہیں، اس مہمل روایت کی تردید کے لیے یہی بات کافی ہے کہ یہ بات یہاں اس عہد فطرت کی خلاف ورزی کی مثال کے طور پر بیان ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۷۲ میں گزرا۔ ظاہر ہے کہ اس عہد میں تمام نسل انسانی کے باپ کی حیثیت سے حضرت آدمؑ سب سے پہلے شریک ہیں تو نعوذ باللہ اگر وہی اس عہد میں بودے ثابت ہو جاتے تو پھر دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ 'صَالِح' کا لفظ عربی میں بھلے چنگے، تندرست، ذی صلاحیت کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت پوری طرح بوجھل ہو جاتی ہے اور وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے تو بیوی اور میاں دونوں پر ایک اندیشے کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس اندیشہ میں وہ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور چونکہ اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا نقش ہے، کسی اور کا نقش نہیں ہے اس وجہ سے یہ توجہ خدا کی طرف بلا شرکت غیرے ہوتی ہے۔ وہ اسی سے دعا کرتے ہیں کہ خدا بھلی چنگی، تندرست و خوب صورت اور ذی صلاحیت اولاد بخشے لیکن جب خدا اولاد دے دیتا ہے تو نہ جانے کن کن کو وہ اس میں شریک بنا بیٹھتے ہیں۔

قرآن میں انسانی فطرت کا یہ خاص پہلو جگہ جگہ بیان ہوا ہے کہ انسان اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو اس کو دوسرے

---

[1] یہ بات محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کی کتاب 'قرآن اور علم جدید' میں میری نظر سے گزری تھی۔ میں خود بدقسمتی سے سائنس کا کبھی طالب علم نہیں رہا۔

اسباب و وسائل کا کرشمہ قرار دینے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا تجربہ ہر شخص خود اپنے اندر کر سکتا ہے۔ انسان کی عام حالت یہی ہے اور یہاں عام حالت ہی بیان ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے بلید بھی پائے جاتے ہوں جو کسی حال میں بھی خدا کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں لیکن فرعون تک کا حال قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ڈوبتے وقت اسے بھی خدا یاد آیا۔ بہرحال مستثنیات سے یہ کلیہ ٹوٹ نہیں جاتا۔ آدمی پر جب حقیقی افتقار کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ دل دل میں یا زبان اور دل دونوں ہی سے خدا کو پکارتا ہے اور یہ عہد بھی کرتا ہے کہ اگر اس مرحلہ یا اس بھنور سے وہ گزر گیا تو آئندہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے گا لیکن جونہی اس مرحلہ سے گزر جاتا ہے، وہ یہ سارا عہد و پیمان بھلا کر انہی خود فراموشیوں میں پھر گم ہو جاتا ہے جن میں پہلے کھویا ہوا تھا۔ اس مسئلہ پر ہم نے اپنی کتابوں میں 'حقیقت شرک' اور 'حقیقت توحید' میں بھی بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔

نظم کے پہلو سے یہ آیات اس مضمون سے تعلق رکھتی ہیں جو اوپر ۱۷۲۔۱۷۴ میں عہد فطرت کا بیان ہوا ہے۔ بیچ میں کچھ آیتیں تنبیہ و تذکیر اور انذار کی نوعیت کی آ گئی ہیں۔ اب یہ پھر اسی مضمون کو لے لیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ انسان کی فطرت کی اصل صدا کیا ہے اور انسان (یہاں خاص اشارہ قریش کی طرف ہے) اپنی فطرت کی اس صدا سے کان بند کر کے کس طرح مختلف دلدلوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

'فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' میں ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفات کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ ملانا جو اس کی بنیادی صفات کو باطل کر دیں بالکل خلاف عقل ہے۔ شرک، جس نوعیت کا بھی ہو، تمام صفات کمال کی نفی کر دیتا ہے اس وجہ سے خدا ایسی تمام نسبتوں اور شرکتوں سے منزہ اور ارفع ہے۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۱۔۱۹۲)

یہ 'تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' کے مضمون کی وضاحت ہے کہ خدا ہی سب کا خالق اور سب کا ناصر ہے تو ان چیزوں کو خدا کی خدائی میں شریک بنانے کا کیا تک ہے جو کسی چیز کو بھی خلق نہیں کرتی ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں اور جو نہ تو ان کی کوئی مدد کر سکنے پر قادر ہیں اور نہ اپنی ہی کوئی مدد کر سکتی ہیں؟

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۹۳۔۱۹۴)

مشرکوں کو چیلنج

'اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ'۔ مطلب یہ ہے کہ معبود سے عابد کی سب سے بڑی احتیاج تو یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں رہنمائی فرماتا ہے لیکن تم جن معبودوں کو پوجتے ہو اگر تم ان کو زندگی کے کسی موڑ پر پکارو کہ وہ تمہاری رہنمائی کریں تو نہ وہ سنیں گے اور نہ تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے ساتھ لگیں گے۔ لفظ 'اتباع'، یہاں اپنے ابتدائی لغوی مفہوم میں ہو گا۔ 'اتبع' مشی خلفہ۔ مضی معہ، لحقہ۔

اس کے پیچھے چلا، اس کے ساتھ ہولیا، اس کو جا پہنچا۔ آگے اس مضمون کی وضاحت یوں ہوئی ہے۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ، تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے۔ تم خیال کرتے ہو کہ وہ تمھیں دیکھ رہے ہیں حالانکہ انھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے) اُدْعُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ یعنی رودھ، چیخو، فریاد کرو یا خاموش رہو، ان کے لیے دونوں یکساں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ الایۃ یعنی یہ خود تمھاری ہی طرح خدا کی مخلوق ہیں تو یہ تمھاری مدد یا رہنمائی کیا کر سکتے ہیں اور اگر تمھارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ تمھاری مدد اور رہنمائی کر سکتے ہیں تو ان کو پکارو، یہ تمھاری مدد کریں۔ یہ مشرکین کو اسی طرح کا چیلنج ہے جس طرح کا چیلنج وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ ۲۳) (اور بلا لو اپنے شریکوں کو بھی جن کو تم اللہ کے سوا مانتے ہو، اگر تم سچے ہو) میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اب تک تو تم نے اپنے ان خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا لیکن اب پیغمبر اور قرآن نے ان سب کی خدائی کو چیلنج کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمھاری مدد اور رہنمائی کے لیے پہنچیں اور تم کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی سنبھالیں۔ اگر انھوں نے اپنی خدائی بچا لی تو بے شک معلوم ہو گا کہ تم سچے ہو۔ یہ بات واضح رہے کہ اہل عرب جن بتوں کو پوجتے تھے وہ ان کے گمان کے مطابق فرشتوں، جنات اور کواکب کے بُت تھے اس وجہ سے ان کو عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فرمایا ہے۔ تفصیل اس کی ہماری کتاب 'حقیقت شرک' میں ملاحظہ فرمائیے۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ، قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۹۵)

بت پرستی کی تردید اس کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے

بت پرستی دو جزوں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ذوات ہیں جن کو بت پرست اپنے زعم کے مطابق خدائی میں شریک مانتے اور ان کو الٰہ قرار دیتے ہیں۔ دوسرے وہ پتھر اور سونے یا چاندی کی مورتیں ہیں جن کو وہ ان ذوات کے پیکر اور قالب کی حیثیت سے ڈھالتے یا تراشتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ ان مظاہر کے اندر ان کے مزعومہ دیوتا حلول کر جاتے ہیں اور ان مظاہر کی پرستش ان آلہہ کی پرستش کا واسطہ اور ذریعہ ہے۔ نظریہ کے اعتبار سے تو بت پرستی کے حامی اس کی حمایت میں یہی بات کہتے ہیں لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ عوام کالانعام سب کچھ ان مورتوں ہی کو سمجھتے ہیں جن کے آگے وہ ڈنڈوت کرتے اور نذر و قربانی پیش کرتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بت پرستی کی اس کے دونوں ہی پہلو سامنے رکھ کر تردید کی ہے۔ اوپر کی آیات میں ذوات کو پیش نظر رکھ کر تردید فرمائی، اب یہ ان کے مظاہر کو پیش نظر رکھ کر اس کی تردید ہو رہی ہے کہ دیکھ لو ان کے جو ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ تم نے بنائے ہیں سب نمائشی اور دکھاوے کے ہیں، یہ اپنے چہرے سے مکھی بھی نہیں ہٹا سکتے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے دودھ اور ملوے کی بھی کتوں اور بلیوں سے حفاظت نہیں کر سکتے تو یہ بھلا تمھاری کیا مدد کر سکیں گے جو تم نے ان کو اپنا ملجا و ماویٰ اور ولی و کارساز بنایا ہے۔

بعینہٖ یہی حقیقت زبور میں بدیں الفاظ واضح فرمائی گئی ہے۔

ان کے بت چاندی اور سونا ہیں۔
یعنی آدمی کی دست کاری۔
ان کے منہ ہیں، پر وہ بولتے نہیں۔
آنکھیں ہیں پر وہ دیکھتے نہیں۔
اُن کے کان ہیں، پر وہ سنتے نہیں۔
ناک ہیں، پر وہ سونگھتے نہیں۔
ان کے ہاتھ ہیں، پر وہ چھوتے نہیں۔
پاؤں ہیں، پر وہ چلتے نہیں۔
اور ان کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔
ان کے بنانے والے انھیں کے مانند ہو جائیں گے۔
بلکہ وہ سب جو ان پر بھروسہ رکھتے ہیں۔
زبور باب ۱۱۵ ۴-۸

قُلِ ادْعُوا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ ' یہ مشرکین کی دھمکیوں کا جواب ہے کہ تم ان بے جان اور بے حرکت مورتوں سے مجھے ڈراتے ہو کہ ان کی مذمت و مخالفت کے نتیجہ میں ان کا غضب مجھ پر بھڑکے گا۔ اگر تم یہ گمان رکھتے ہو تو تم اپنے ان سب دیویوں دیوتاؤں کو اپنی مدد کے لیے پکارو اور میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو کر گزرو، ذرا بھی رعایت نہ برتو اور ایک دن کے لیے بھی مجھے مہلت نہ دو۔

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۖ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۱۹۶ - ۱۹۸)

اللہ تعالیٰ کی شان

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰہُ الایۃ۔ 'وَلِیّ' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، حامی و ناصر اور مرجع و کارساز کے آتے ہیں۔ اوپر آیات ۱۹۲-۱۹۳ میں گزر چکا ہے کہ یہ بت جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں ان کی تو کیا مدد کریں گے خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور اگر یہ ان کو مدد و نصرت اور حمایت و ہدایت کے لیے پکاریں تو ان کا پکارنا اور نہ پکارنا دونوں یکساں ہے، وہ ان کی مدد و رہنمائی کے لیے کبھی نہیں پہنچیں گے۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی شان بیان ہو رہی ہے کہ میرا حامی و ناصر وہ اللہ ہے جس نے میری اور خلق کی ہدایت کے لیے نہایت اہتمام کے ساتھ کتاب اتاری ہے اور جو اپنے نیکوکار اور صالح بندوں کو دوست رکھتا اور ہر مرحلہ میں ان کی مدد اور رہنمائی فرماتا ہے۔ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'نَزَّلَ' میں اہتمام کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی اس نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے بندوں

کی رہنمائی کے لیے کتاب اتاری ہے۔ یوں تو بندہ ہر چیز کے لیے اپنے رب ہی کا محتاج ہے لیکن اس کی سب سے بڑی احتیاج ہدایت کے لیے ہے جس کا اہتمام خدا ہی نے فرمایا ہے تو آخر یہ اصنام و آلہہ کس مرض کی دوا ہیں اور کس احتیاج کے لیے ان کی پوجا ہو رہی ہے۔

'وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ الایۃ' یہ اوپر آیت ۱۹۲ کا مضمون کسی قدر اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اعجاز بیان کی ایک مثال

'وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا' یہ اوپر آیت ۱۹۳ کے مضمون کی وضاحت ہے یہاں 'لَا يَسْمَعُوْا' کا لفظ 'لَا يَتَّبِعُوْكُمْ' کے صحیح مفہوم پر روشنی ڈال رہا ہے۔ 'وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ' اس ٹکڑے میں 'رویت'، 'نظر' اور 'ابصار' کے الفاظ اس خوبی سے استعمال ہوئے ہیں کہ بس قرآن کا اعجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے بصرو، تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ تمھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں سوجھتا سمجھاتا کچھ بھی نہیں۔ 'تَرٰىهُمْ' میں واحد کا خطاب، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، جمع کے مفہوم میں ہے اور مخاطب مشرکین ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (۱۹۹-۲۰۲)

پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو بعض ہدایات

'خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ'۔ اب یہ سورہ کے آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطہ سے مسلمانوں کو بعض مناسب وقت ہدایات دی گئی ہیں۔ لفظ 'عفو' جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو دل سے معاف کر دینے کے معنی میں نہیں بلکہ مجرد درگزر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ 'عُرف' ایسی بات کو کہتے ہیں جو عقل اور فطرت اور معقول لوگوں کے نزدیک جانی پہچانی ہوئی ہو۔ یہاں اس سے مراد توحید و معاد اور نیکی و عدل کی وہی باتیں ہیں جن کی اس دور میں اہل عرب کو دعوت دی جا رہی تھی اور جو یکسر عقل و فطرت کی شہادت پر مبنی اور سلیم الفطرت طبائع کے لیے ان کے دل کی آواز تھیں۔ فرمایا کہ تم توحید اور معاد، نیکی اور عدل کی جو دعوت دے رہے ہو اس پر جمے رہو اور ان جاہلوں کی ژاژ خائیوں سے ابھی درگزر کرو۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہ اپنی ان بوالفضولیوں کا نتیجہ خود دیکھ لیں گے۔

'وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ الایۃ' 'نَزْغ' کے معنی چرکا لگانا، کچوکا لگانا، زخم پہنچانا۔ یہ تدبیر بیان ہوئی ہے روش عفو پر قائم رہنے اور جاہلوں کی روش سے اعراض اور ان کے کچوکوں اور طعنوں کے صدمات سے اپنے دل کو محفوظ رکھنے کی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شیاطین جن و انس کی ہرزہ سرائیوں اور خاکبازیوں سے دل کو کوئی صدمہ پہنچے تو اپنے رب کی پناہ ڈھونڈو۔ تمھارا رب سمیع و علیم ہے، تم جب بھی اس کی طرف رجوع کرتے ہو وہ تمھاری دعائیں اور فریادیں سنتا، تمھارے حالات اور پریشانیوں کو جانتا

ہے اور شیاطین کی فتنہ انگیزیوں اور چیرہ دستیوں سے بھی وہ اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ تمہارے ہر غم کو دور فرمائے گا۔

'اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا' اور 'خُذِ الْعَفْوَ' میں خطاب اگرچہ لفظاً واحد سے ہے لیکن یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے تمام مسلمانوں سے ہے چنانچہ اس آیت میں جمع کے اسلوب نے اس مخفی حقیقت کو واضح کر دیا۔ فرمایا کہ جو لوگ جہالت کے بجائے تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں جب کبھی ان کو جاہلوں کی جہالت اور شیاطین کی شیطنت کا کوئی جھٹکا لگتا ہے تو وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں جس سے فوراً ان کا باطن روشن ہو جاتا ہے اور اشرار و معاندین کی ساری خاکبازی کے باوجود ان کی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ یہ گویا اس 'استعاذہ' کا طریقہ اور فائدہ بتا دیا گیا جس کی اوپر والی آیت میں ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ میں داخل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو یاد کرے۔ یہ چیز دل کے اندر ایسی بصیرت اور ایسی قوت و ہمت پیدا کر دے گی کہ دفعتہً آنکھوں کے آگے کا سارا غبار چھٹ جائے گا۔

'وَاِخْوَانُھُمْ یَمُدُّوْنَھُمْ'۔ 'ھُمْ' کا مرجع وہ 'جاہلین' ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۱۹۹ میں گزرا۔ 'اخوان' سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جن کے ہاتھوں میں ان کی باگ ہے، عام اس سے کہ وہ شیاطین انس میں سے ہوں یا شیاطین جن میں سے۔ فرمایا کہ اہل ایمان کو تو خدا کی یاد سنبھال لیتی ہے لیکن جاہلین کو ان کے شیاطین گمراہی کی وادیوں میں بھٹکاتے بھٹکاتے آخری منزل پر پہنچا دیتے ہیں، ذرا بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے کہ بازگشت کا کوئی امکان باقی رہے۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِھِمْ بِاٰیَۃٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَھَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ ھٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۲۰۳-۲۰۴)

شیطانی طعنے اور ان کا مقابلہ

یہ ان شیطانی طعنوں اور نزغات کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن سے کفار کے ہاتھوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت سابقہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم ان کے مطالبہ پر ان کے انتخاب کے مطابق معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ تمہیں طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کہیں سے کیوں نہیں چھانٹ لائے؟ اس قول سے ظالموں کا مطلب یہ ہوتا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا معاملہ تو بہت آسان ہے۔ ادھر ادھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور کاہنوں اور اہل کتاب کی روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں ان میں سے جو باتیں دل کو بھا گئیں ان کو جوڑ جاڑ کر کچھ کلام بنایا اور اس کو لا کر ہمیں اس دعوے کے ساتھ سنا دیا کہ یہ اللہ نے اپنے خاص فرشتے کے ذریعہ سے وحی بھیجی ہے لیکن اب ہم نے مطالبہ جو معجزے کا رکھ دیا ہے تو تمہاری کچھ پیش نہیں جاتی اس لیے کہ ادھر ادھر سے باتیں چھانٹ لینا اور چیز ہے، معجزہ دکھانا اور چیز ہے۔ یہ چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ کر لاتے اور ہمیں دکھا دیتے کہ یہ لو، تمہارا مطالبہ

پورا کر دیا۔ گویا اس طعنہ میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے ہی کا طعنہ نہیں بلکہ اس سے زیادہ زہر آلود طعنہ اس کے اندر یہ مضمر ہے کہ نعوذ باللہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جو ادھر ادھر سے اپنے ذوق کے مطابق چھانٹی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔

'اِجْتِبَاءٌ' کا اصل لغوی مفہوم تو مجموعہ میں سے کسی چیز کو انتخاب کر لینا اور چھانٹ لینا ہے لیکن جب طنز کے سیاق و سباق میں یہ لفظ استعمال ہو، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی گھڑنے اور بنا لینے کے ہو جائیں گے اسی وجہ سے فرا نے اس کی تفسیر 'اِخْتَلَقْتَهَا اِفْتَرَيْتَهَا' سے کی ہے اور یہ تفسیر ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ طنزیہ اسلوب میں الفاظ کے مفہوم بدل جایا کرتے ہیں۔

'قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ الاية' یہ پیغمبر کی طرف سے کفار کے مذکورہ بالا طنز کا جواب ہے اور دیکھیے کیسا باوقار اور بھرپور جواب ہے۔ فرمایا کہ کہہ دو تم جو چاہو سمجھو اور جو چاہو کہو، میں تو بس اسی وحی کی پیروی کر رہا ہوں جو میرے اوپر میرے رب کی جانب سے آتی ہے۔ اوپر جاہلوں کی جہالت سے اعراض کی جو ہدایت ہوئی تھی، یہ جواب اس ہدایت کی تعمیل کی بہترین مثال ہے۔ ان کی جاہلانہ بات کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا، صرف اصل حقیقت نہایت سادہ مگر نہایت باعظمت اسلوب میں ظاہر فرما دی 'هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ' یعنی تم اس چیز کو میری گھڑی ہوئی چیز کہتے ہو لیکن یہ تمہارے رب کی جانب سے آنکھوں اور دلوں کے پردے اٹھا دینے والی آیتیں اور تمہارے لیے ہدایت و رحمت ہیں۔ ہدایت اپنے آغاز کے اعتبار سے اور رحمت اپنے انجام کے لحاظ سے۔ لیکن یہ ان کے لیے نافع ہیں جو ایمان لائیں۔ 'لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' میں یہ لطیف تلمیح بھی مضمر ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اصل خرابی تمہارے اپنے دلوں کے اندر ہے کہ تم حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

طنز کا باوقار اور بھرپور جواب

'وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ الاية' اب یہ بتایا ہے کہ قرآن کی ہدایت و بصیرت سے مستفید ہونے کا طریقہ کیا ہے، فرمایا کہ جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموشی سے اس پر کان لگاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو رحمت الٰہی تمہاری طرف متوجہ ہوگی اور اس پر ایمان لانے کے لیے تمہارے دل کھلیں گے 'انصات' کے معنی خاموشی سے کسی کی بات سننے کے لیے کان لگانا ہے۔ اس میں کفار کے اس غلط رویہ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے قرآن کے معاملہ میں اختیار کر رکھا تھا۔ سورہ فصلت میں ہے 'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ ۲۶ فصلت' (اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو اور جب سنایا جائے تو اس میں گھپلا ڈالو) فرمایا کہ یہ روش جہالت کی روش ہے جس کا نتیجہ رحمت سے محرومی ہے۔ صحیح روش اس کے بالکل برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو سنو اور شور و شغب کے بجائے خاموشی سے کان لگا کر سنو۔ یہ طریقہ اس رحمت سے مستفید ہونے کا ہے۔

قرآن سے مستفید ہونے کا طریقہ

اس آیت کو ہمارے فقہا کے ایک گروہ نے امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک دلیل کا بھی ماخذ بنایا

ہے۔ لیکن یہ آیت، جیساکہ واضح ہے، اس سیاق و سباق کی آیت نہیں ہے اور اگر سیاق و سباق سے قطع نظر کرکے کوئی اس طرح کا استنباط آیت سے کرنا ہی چاہے تو بات ان لوگوں کے حق میں نہیں جاتی جو امام کے پیچھے یک قلم فاتحہ پڑھنے کے مخالف ہیں بلکہ ان لوگوں کے حق میں جاتی ہے جو جہری نمازوں میں تو فاتحہ پڑھنے سے روکتے ہیں لیکن سری میں نہیں روکتے۔

وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ (۲۰۴-۲۰۶)

'وَاذْكُر رَّبَّكَ الآية' اوپر خدا کی پناہ میں آنے کا طریقہ خدا کو یاد کرنا بتایا ہے۔ اب خدا کو یاد کرنے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ اس کے لیے تین باتیں ارشاد ہوئیں۔

ایک یہ کہ یہ فروتنی، مسکنت، لجاجت اور خوف کے ساتھ دل دل میں ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناز، تدلل اور احساس استحقاق و استکبار اس کے منافی ہے۔

دوسری یہ کہ اگر قول سے ذکر ہو تو دون الجہر ہو یعنی بہت زیادہ بلند آواز سے نہ ہو۔ اس بات کی وضاحت سورہ بنی اسرائیل میں یوں ہوئی ہے۔ 'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا۔ بنی اسرائیل ۱۱۰' (اور اپنی دعا نہ بہت بلند آواز سے کرو، نہ بہت پست آواز سے، ان کے درمیان کی راہ اختیار کرو) یہ ہدایت مشرکین کے طریقہ سے بچانے کے لیے بھی ہوئی اور اس لیے بھی کہ ہمارا پروردگار سمیع و علیم ہے، نعوذ باللہ بہرا نہیں ہے۔ یاد ہوگا کہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زیادہ بلند آواز سے ذکر کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا تھا۔ علاوہ ازیں اس میں ریا، شہرت اور نمائش کا بھی زیادہ امکان ہے جو اخلاص کے بالکل منافی چیزیں ہیں۔

تیسری یہ کہ اللہ کی یاد ہر وقت رہنی چاہیے۔ 'بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ' کے الفاظ، جیساکہ ہم دوسرے مقام میں واضح کرچکے ہیں، احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتے ہیں جس طرح ہم صبح و شام کے الفاظ بولتے ہیں اسی طرح عربی میں یہ الفاظ ہیں۔ 'وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ' اسی مفہوم کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی خدا کی یاد سے کسی وقت بھی غفلت نہ ہو۔ جس طرح جسم کی زندگی کے لیے سانس کی آمد و شد ضروری ہے، اسی طرح روح کی زندگی کے لیے ذکر الٰہی ضروری ہے۔ شیطان ہر وقت حملہ کی گھات میں رہتا ہے کسی وقت بھی اس کام سے غافل نہیں ہوتا اس وجہ سے اس سے پناہ حاصل کرنے کے لیے جو حرز ہے آدمی کو اس سے بھی کسی وقت غفلت نہیں ہونی چاہیے۔ اس ذکر کی شکلیں اور صورتیں حالات، ضروریات مقتضیات اور اوقات کی تبدیلی سے بدل بدل جاتی ہیں لیکن اس سے غفلت کسی وقت بھی جائز نہیں۔ انسان جہاں غافل ہوا شیطان کسی نہ کسی راہ سے حملہ آور ہو جائے گا —— اس امر کی یاددہانی کی یہاں ضرورت نہیں ہے کہ خطاب اگرچہ بصیغہ واحد ہے لیکن اس کی نوعیت وہی ہے جو اوپر آیت ۱۹۹ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔

'اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ الایۃ" "جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں" سے اشارہ فرشتوں کی طرف ہے۔ ان کے بابت فرمایا کہ وہ خدا کی بندگی سے کسی وقت سرتابی نہیں کرتے، برابر اس کی تسبیح میں لگے رہتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ آیت ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں برابر سرگرم رہنے والوں کے زمرہ کو بتاتی ہے کہ جو لوگ خدا کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں گو وہ رہتے بستے زمین میں ہیں لیکن ان کا تعلق فرشتوں کی بزم قدس سے ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح وہ ہر وقت زمزمہ سنج تسبیح و تہلیل رہتے ہیں، یہ بھی اسی طرح مصروفِ یادِ الٰہی رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس میں مشرکین پر تعریض بھی ہے کہ یہ تو فرشتوں ہی کی سفارش کے بل پر اکڑتے پھرتے ہیں، نہ خدا کو خاطر میں لاتے ہیں نہ رسول کو لیکن خود فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت خدا کے آگے تسبیح و سجود میں لگے ہوئے ہیں۔

سورۂ اعراف کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو قلم بند ہوئیں۔ جو باتیں صحیح قلم سے نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نکلی ہیں۔ جو غلط نکلی ہیں وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ضرر سے مجھ کو اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو محفوظ رکھے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

لاہور
۲۱ شعبان ۱۳۸۸ ھ
۱۳ نومبر ۱۹۶۸ ء